حجیت حدیث اور انکار حدیث

ایک تحقیقی و تجزیاتی مطالعہ

ڈاکٹر حافظ محمد زبیر

مکتبہ رحمۃ للعالمین

نام کتاب:	حجیت حدیث اور انکار حدیث: ایک تحقیقی و تجزیاتی مطالعہ
مصنف:	ڈاکٹر حافظ محمد زبیر
تہذیب و ٹائیٹل:	ابوالحسن علوی
ناشر:	مکتبہ رحمۃ للعالمین
صفحات:	84
قیمت:	100روپے
طبع اول:	نومبر،2016ء

ای میل:	mzubair@ciitlahore.edu.pk
	hmzubair2000@hotmail.com

مصنف کی کتب کے ملنے کا پتہ:

☆ عبدالمتین مجاہد: 36-K، ماڈل ٹاؤن، لاہور۔ 0300-4199099

☆ مجلس تحقیق اسلامی، 99-J، ماڈل ٹاؤن، لاہور۔ 042-35839404

☆ قرآن اکیڈمی، یسین آباد، فیڈرل بی ایریا، کراچی۔ 021-36337361

مصنف کی دیگر کتب:

☆ صالح اور مصلح

☆ اسلام اور مستشرقین

☆ مولانا وحید الدین خان: افکار و نظریات

☆ فکر غامدی: ایک تحقیقی و تجزیاتی مطالعہ

☆ عصر حاضر میں تکفیر، خروج، جہاد اور نفاذ شریعت کا منہج

☆ چہرے کا پردہ: واجب، مستحب یا بدعت؟

جملہ کتب کے پی ڈی ایف ورژن کا ڈاؤن لوڈ لنک:

http://kitabosunnat.com/musannifeen/muhammad-zubair-temi.html

حجیت حدیث اور انکار حدیث

ایک تحقیقی و تجزیاتی مطالعہ

ڈاکٹر حافظ محمد زبیر
اسسٹنٹ پروفیسر، کامساٹس انسٹی ٹیوٹ آف انفارمیشن ٹیکنالوجی، لاہور
ریسرچ فیلو، مجلس تحقیق اسلامی، ماڈل ٹاؤن، لاہور
ریسرچ فیلو، شعبہ تحقیق اسلامی، قرآن اکیڈمی، لاہور

مکتبہ رحمۃ للعالمین

لاہور

بسم الله الرحمن الرحيم
In The Name Of Allah, The Most Beneficent, The Most Merciful

﴿وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ﴾ [النحل: 44]

”اور ہم نے آپ کی طرف قرآن مجید کو نازل فرمایا تاکہ آپ لوگوں کے لیے اُس کی شرح کریں کہ جسے اُن کی طرف نازل کیا گیا ہے اور تاکہ لوگ بھی غور و فکر کریں۔“

انتساب

شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ کے نام

کہ جن کی مساعی سے برصغیر پاک وہند میں علم حدیث کو فروغ ملا۔

فہرست مضامین

مقدمہ

موضوع کا تعارف

انکار حدیث اور حجیت حدیث دراصل دو موضوعات ہیں۔ انکار حدیث سے مراد حدیث کے انکار کا فتنہ ہے کہ جس کی طرف آپ ﷺ ان الفاظ میں اشارہ فرما گئے ہیں کہ میرے بعد ایک شخص پیدا ہو گا جو گاؤ تکیہ لگا کر بیٹھا ہو گا اور یہ کہے گا کہ قرآن مجید کو مضبوطی سے تھام لو۔ اور جو اس میں حلال ہے، اسے حلال سمجھو۔ اور جو اس میں حرام ہے، اسے حرام قرار دو۔ پس اس کا مقصد یہ ہو گا کہ وہ لوگوں کو باور کروائے کہ قرآن مجید کے علاوہ تمہیں کسی چیز کی طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جس چیز کو اللہ کے رسول ﷺ نے حرام ٹھہرایا ہے تو وہ بھی ویسے ہی حرام ہے جیسا کہ وہ شیء حرام ہے کہ جسے اللہ عزوجل نے قرآن مجید میں حرام کہا ہے۔ یہ روایت سنن ترمذی، سنن ابن ماجہ، سنن ابو داؤد اور مسند احمد وغیرہ میں موجود ہے۔ قرآن مجید میں سورۃ التوبہ کی آیت 29 میں اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ کی یہ صفت بیان کی گئی ہے کہ وہ اس کو حرام نہیں سمجھتے کہ جسے اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے حرام قرار دیا ہو۔ قرآن مجید کی اس آیت سے واضح طور معلوم ہوا کہ کچھ چیزوں کو اللہ نے حرام قرار دیا اور کچھ کو اللہ کے رسول ﷺ نے حرام قرار دیا ہے۔

پس اس آیت اور روایت سے معلوم ہوا کہ اسلام کے بنیادی مصادر دو ہیں۔ قرآن مجید اور سنت رسول ﷺ۔ اب جن لوگوں نے سنت رسول ﷺ کو دین کا بنیادی ماخذ ماننے سے انکار کر دیا تو وہ منکرین حدیث کہلائے اور ان کا یہ رویہ انکار حدیث کہلاتا ہے۔ پس اس امت میں کچھ لوگ تو ایسے ہو گزرے کہ جنہوں نے حدیث کا کلیتاً انکار کیا جبکہ کچھ گروہ ایسے بھی پیدا ہوئے کہ جنہوں نے بعض احادیث کو مان لیا اور بعض کا انکار کر دیا۔ اس کتابچے میں ہم نے دونوں گروہوں کے افکار کا تنقیدی اور تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے اگرچہ دونوں کا حکم فرق ہے۔

یہ بھی واضح رہے کہ "انکارِ حدیث" اور "ردِ حدیث" میں فرق ہے۔ اگر آپ تحقیق

کے رستے کسی حدیث کو ضعیف یا موضوع (fabricated) ثابت ہونے کی وجہ سے مردود (rejected) قرار دے رہے ہیں تو یہ رویہ درست ہے لیکن اگر آپ اصول حدیث کی روشنی میں اور ائمہ محدثین کی تحقیق کے نتیجے میں صحیح ثابت ہو جانے والی احادیث کو قبول کرنے سے انکار کر رہے ہیں تو یہ رویہ انکارِ حدیث کہلاتا ہے۔ انکار حدیث ایک جارحانہ رویہ (aggressive approach) ہے کہ جس میں پہلے سے طے ہوتا ہے کہ ہم نے حدیث کو رد کرنا ہے جبکہ حدیث کا قبول ورد ایک علمی رویہ (academic approach) ہے کہ جس میں اصولِ تحقیقِ حدیث کی روشنی میں یہ فیصلہ کیا جاتا ہے کہ اس حدیث کو قبول کیا جائے گا یا رد کیا جائے گا۔

انکارِ حدیث کے جواب میں جو علم مسلمانوں میں مدون ہوا، وہ حجیت حدیث کا فن تھا۔ انکارِ حدیث میں حدیث کا انکار کرنے والوں کے دلائل کا تجزیہ کیا جاتا ہے تو حجیت حدیث میں حدیث کے حجت (authority) ہونے کے دعوی کے دلائل کو زیر بحث لایا جاتا ہے۔ پس اس کتاب میں حدیث کے بارے ان دونوں پہلوؤں کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے۔ جہاں انکارِ حدیث کے دلائل کا تجزیہ کیا گیا ہے، وہاں حدیث کی حجیت کے دلائل بھی بیان کیے گئے ہیں۔ پس ہم کہہ سکتے ہیں کہ انکارِ حدیث سلبی پہلو ہے تو حجیت حدیث ایجابی پہلو ہے۔ حجیت حدیث کے پہلو سے زیادہ تر تحقیقی اور فکری جبکہ انکارِ حدیث کے حوالے سے زیادہ تر تنقیدی اور تجزیاتی ابحاث شامل کتاب کی گئی ہیں۔

حجیت حدیث کے حوالے سے ایک پہلو پر کام کی اشد ضرورت محسوس ہوتی ہے اور وہ احادیث کے متون کے سیاق (context) کا مطالعہ ہے۔ قرآن مجید میں تو شان نزول کی ابحاث موجود ہیں کہ مفسرین نے ہر آیت مبارکہ کے سیاق کو سبب نزول کے نام سے بیان کیا ہے لیکن احادیث میں یہ کام اتنا زیادہ نہیں ہوا۔ بعض اوقات ایک حدیث کے سیاق کے مطالعے سے اس کا جو مفہوم واضح ہوتا ہے تو اس سے بھی بہت ایسے اعتراضات رفع ہو جاتے ہیں جو حدیث کے صرف متن کے مطالعہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور حدیث کے سیاق کا مطالعہ دو طرح سے کیا جا سکتا ہے؛ ایک یوں کہ حدیث کے

متن کے جمیع طرق اور اسناد کو جمع کیا جائے اور ان میں مروی الفاظ کے اختلافات اور کمی بیشی کو سامنے رکھتے ہوئے بات کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ اس پہلو سے تو حدیث پر کام ہوا ہے لیکن دوسرا پہلو کہ جس پر تا حال کام نہیں ہے، وہ تاریخ کی روشنی میں احادیث کے متون کا مطالعہ ہے۔ پس علم تاریخ سے آپ اس سیاق کو جاننے کی کوشش کریں کہ جو اس قول یا فعل رسول ﷺ کا سبب بنا ہے۔ مثال کے طور پر غدیر خم مقام پر دیے گئے خطبے کی روایت کا اگر ہم اسبابتاریخ کی کتب سے تلاش کریں تو اس خطبے کے نہ صرف الفاظ بلکہ غرض وغایتکو سمجھنا بھی بہت ہی آسان ہو جاتا ہے۔ پس جب آپ ان وجوہات کو جان لیں گے کہ جو اس خطبے کا سبب بنیں تو اس خطبے کا اصل معنی ومفہوم سمجھنا بہت ہی آسان ہو جائے گا۔ اور اگر آپ اس خطبے کے شان نزول کو سامنے نہ رکھیں گے تو پھر صرف متن سے فکری غلو بھی پیدا ہو سکتا ہے۔

تالیف کا پس منظر اور مقصد

کچھ عرصہ پہلے کچھ لوگوں نے سوشل میڈیا پر احادیث پر اعتراضات کی ایک تحریک شروع کی کہ جس میں ثابت شدہ صحیح احادیث اور آثار کے بارے تمسخر اور استہزاء کا رویہ اختیار کیا گیا۔ ان لوگوں میں قاری حنیف ڈار صاحب پیش پیش تھے جو کہ غامدی مکتب فکر سے متاثر ہیں۔ گجرات سے تعلق ہے لیکن آج کل جامع مسجد پاکستان سینٹر، ابو ظہبی میں خطیب ہیں۔ قاری صاحب نے اپنے فیس بک پیج کی وال کو احادیث کے خلاف مواد سے بھر دیا اور علم نہ رکھنے والے سادہ لوح مسلمانوں نے ان سطحی اعتراضات کو خوب شیئر کیا۔ علاوہ ازیں انعام رانا صاحب بھی اس تحریک میں شامل ہو گئے۔ رانا صاحب پیشہ کے اعتبار سے وکیل ہیں اور لندن میں مقیم ہیں۔ مکالمہ کے نام سے ایک ویب سائیٹ چلاتے ہیں۔ اسی طرح پروفیسر ڈاکٹر طفیل ہاشمی صاحب نے بھی کچھ پوسٹوں میں درایت کے اصول کی روشنی میں احادیث کی حجیت کو موضوع بحث بنایا۔

اس کے علاوہ بھی کچھ لوگوں نے سوشل میڈیا پر لکھنا شروع کیا تو احادیث رسول ﷺ اور آثار صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بارے بد ظنی کی ایک فضا عام ہو گئی۔ ملحدین

(atheists) جو کہ سوشل میڈیا پر سر گرم تھے، انہوں نے ان اعتراضات کو کاپی پیسٹ کیا اور خوب مرچ مسالا لگا کر پھیلایا اور عام کیا کہ جس سے عام مذہبی طبقے میں بھی بے چینی پھیل گئی۔ اس صورت حال کے پیش نظر کئی ایک مخلص علماء اور طلباء نے احادیث کی حجیت کے حق میں لکھا۔ راقم نے بھی قاری حنیف ڈار صاحب اور دیگر حضرات کے جواب میں کئی ایک تحریریں مرتب کی تھیں کہ بعض دوستوں نے اصرار کیا کہ ان تحریروں میں بعض اہم نکات آ گئے ہیں، لہذا انہیں کہیں شائع ہو جانا چاہیے۔ پس سوشل میڈیا کی انہی تحریروں کو کچھ تہذیب اور تنقیح کے بعد ایک مضمون کی شکل میں مرتب کیا گیا تا کہ احادیث پر معاصر اعتراضات کی حقیقت کا تجزیہ کیا جا سکے۔

اس کتابچے کی تحریریں تین قسم کی ہیں۔ پہلی قسم میں جو تحریریں شامل کی گئی ہیں، تو وہ اصولی نوعیت کی ہیں کہ جن میں قرآن مجید اور احادیث کی حجیت کے بارے اصولی اور نظری بحثیں موجود ہیں۔ اس حصے کی تحریروں میں بحث کا مرکزی نکتہ یہ ہے کہ قرآن مجید جس ذریعے سے ثابت ہوتا ہے، اسی ذریعے سے احادیث بھی ثابت ہوتی ہیں۔ دونوں کے ثبوت کا ذریعہ ایک ہی ہے اور اس سے قطعیت (certainty) حاصل ہوتی ہے۔ دوسری قسم میں کتب احادیث، خاص طور صحیح بخاری کی حجیت اور اہمیت کے بارے بحث کی گئی ہے۔ اس حصے کی تحریروں میں خاص طور صحیح بخاری کے بارے منکرین احادیث کی غلط فہمیوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اور تیسری قسم کی تحریروں میں بعض احادیث پر منکرین احادیث کے عقلی و منطقی اعتراضات کا تنقیدی تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ اس طرح اصولی اور فروعی دونوں صورتوں میں احادیث کی حجیت اور ان کے انکار کے مسئلے کو علمی و عقلی بنیادوں پر پرکھا گیا ہے۔ یہ تحریر سہ ماہی حکمت قرآن اکتوبر تا دسمبر 2016ء میں شامل اشاعت ہے اور ہماری نئی کتاب "مکالمہ" کا آخری باب بھی یہی ہے۔ اس تحریر کی افادیت کے پیش نظر اسے علیحدہ سے بھی شائع کیا جا رہا ہے۔

اظہار تشکر

میں ان تمام دوستوں کا شکر گزار ہوں کہ جنہوں نے اس موضوع پر لکھنے کے

لیے مجھے نہ صرف ترغیب دلائی بلکہ اس لکھے ہوئے کو سوشل میڈیا پر پھیلانے اور عام کرنے میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ اور یہی وہ دوست ہیں کہ جنہوں نے شغل میلہ اور تفریح کے لیے بنائی جانے والی ویب سائیٹس کو سنجیدہ علمی موضوعات اور صالح اسلامی فکر کی ترویج اور نشر واشاعت کا ذریعہ بنالیا۔

میں اپنی اہلیہ محترمہ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ جن کے تعاون اور حوصلے سے یہ کتاب پایہ تکمیل کو پہنچ پائی۔ حوصلہ اس لیے کہا کہ عموماً انہیں شکوہ رہتا ہے کہ میں فیس بک پر بیٹھ کر اپنا وقت ضائع کرتا رہتا ہوں لیکن یہ کتابچہ اور اس جیسی کئی ایک ہماری تحریریں اس بات کی شاہد ہیں کہ فیس بک پر اتنا بھی وقت ضائع نہیں ہوتا جتنا کہ اس کے بارے میں گمان رکھا جاتا ہے۔ باقی فیس بک کے نقصانات ضرور ہیں، ان سے انکار ممکن نہیں ہے لیکن کچھ فوائد بھی ہیں، انہی کا ذکر کرنا اس وقت مقصود تھا۔

جزاکم اللہ خیرا
ابو الحسن علوی

قرآن مجید کی روایات

ہمارے دین کے دو بنیادی مصادر ہیں۔ قرآن مجید اور سنت۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین جب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن مجید نقل کرتے ہیں تو ان کے اس نقلِ قرآن کو اصطلاح میں "قراءت" کہتے ہیں اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین جب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے سنت نقل کرتے ہیں تو ان کے اس نقلِ سنت کو "حدیث" کہتے ہیں۔ پس قراءت، قرآن مجید کی روایت ہے اور حدیث، سنت کی روایت ہے۔

قرآن مجید اور سنت ہمیں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے قطعی خبر کے ذریعے سے ملے ہیں۔ قرآن مجید کی وہ روایات جو قطعی طور ثابت ہیں اور جنہیں امت میں تلقی بالقبول حاصل ہے اور ان پر امت کا اجماع ہے تو وہ کل بیس روایات ہیں کہ جنہیں اصطلاح میں قراءات سبعہ عشرہ بھی کہتے ہیں۔ قراءات کے امام دس ہیں کہ جن کے شاگرد بیس ہیں اور قرآنی روایات انہی شاگردوں کے نام سے منسوب ہیں۔[1]

امت مسلمہ کے پاس اس وقت جو قرآن مجید موجود ہے، وہ انہی قراء کی سند سے موجود ہے۔ اگر ان قراء کو درمیان سے نکال دیا جائے تو امت کے پاس موجود مصحف کو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا چھوڑا ہوا مصحف ثابت کرنا ممکن نہیں ہے۔ مسلم دنیا میں اس وقت قرآن مجید کی چار روایات رائج ہیں کہ جن میں معروف ترین روایت، "روایتِ حفص" ہے جبکہ دوسرے نمبر پر "روایتِ وَرش" ہے۔ ان کے علاوہ روایتِ قالون، روایتِ دُوری بھی بعض ممالک میں عوامی طور پر پڑھی پڑھائی جاتی ہیں۔

قرآن مجید کی "روایتِ دُوری" سوڈان، صومالیہ، نائیجیریا، چاڈ اور وسطی افریقہ میں عوامی سطح پر پڑھی پڑھائی جاتی ہے۔ قرآن مجید کی "روایتِ قالون" لیبیا اور تیونس میں پڑھی پڑھائی جاتی ہے۔ قرآن مجید کی "روایتِ ورش" الجزائر، موریطانیہ، مراکش، مالی، سینیگال وغیرہ میں پڑھی پڑھائی جاتی ہے۔ اور مسلم دنیا کے اکثر حصے میں "روایتِ

[1] مودودی، ابو الاعلی، سید، قرآن مجید میں قراءتوں کا اختلاف، ماہنامہ رشد، ستمبر 2009ء، مجلس تحقیق اسلامی، لاہور، ص 48-49

حفص" پڑھی پڑھائی جاتی ہے۔ یہی روایت ہمارے ہاں جنوبی ایشیا اور مشرق وسطی میں رائج ہے۔[1]

دنیائے اسلام کے مشرق میں اگر مصحف، روایتِ حفص میں شائع ہوتے ہیں تو بلادِ مغرب اور افریقہ میں مصاحف کی اشاعت روایتِ ورش، قالون اور دُوری میں ہوتی ہے۔ اور بلادِ مغرب میں لاکھوں قراء کرام اور کروڑوں عوام الناس اپنی نمازوں اور نمازوں کے علاوہ میں بھی تلاوت اپنی روایت کے مطابق ہی کرتے ہیں۔ امت کا اس بات پر اجماع ہے کہ یہ سب روایات قطعی طور اللہ کے رسول ﷺ سے ثابت ہیں۔

حال ہی میں شاہ فہد پرنٹنگ پریس، مدینہ منورہ، سعودی عرب نے بلادِ مغرب اور افریقہ کے مسلمانوں کے لیے ان کی روایات میں قرآن مجید پبلش کیے ہیں۔ جن میں سے ایک معروف روایت، "روایت ورش عن نافع" ہے۔ یہ مصحف اسی طرح سے پبلش کیا گیا ہے جیسا کہ بلادِ مغرب میں موجود مسلمان حکومتوں کی وزارت اوقاف انہیں اپنی عوام کے لیے شائع کرتی ہے۔ بلادِ مغرب کے ان شائع شدہ مصاحف میں ہمارے ہاں کے شائع شدہ مصاحف سے کچھ رسم، کچھ قراءات اور کچھ ضبط کے اختلافات ہیں۔ اور یہ تینوں مختلف علوم ہیں کہ جنہیں علوم قرآنیہ کے طلباء ہی اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر بلادِ مغرب میں جو مصاحف شائع ہوتے ہیں، ان میں بسم اللہ کو سورۃ الفاتحہ اور سورۃ البقرۃ کی پہلی آیت شمار کیا گیا ہے اور انہیں سورت میں شامل کر کے لکھا گیا ہے[2] جبکہ ہمارے ہاں شائع شدہ مصاحف میں بسم اللہ کو سورت سے علیحدہ لکھا جاتا ہے اور اسے سورۃ الفاتحہ اور سورۃ البقرۃ کی مستقل آیت شمار نہیں کیا جاتا۔ یہ قراءت کا اختلاف ہے۔ اسی طرح بلادِ مغرب کے مصاحف میں قاف کو لکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کے اوپر ایک نقطہ ڈالا جاتا ہے جبکہ ہمارے ہاں قاف کے اوپر دو نقطے

---

[1] نعیم الرحمن ناصف، حافظ، رشد قراءات نمبر اور منکرین حدیث کی بوکھلاہٹ، ماہنامہ رشد، مارچ 2010ء، مجلس تحقیق اسلامی، لاہور، ص 14

[2] Al-Quran Al-Kareem bi Riwayat e Warsh, Retrieved 01 November, 2016 from https://archive.org/details/standard1-quran

ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں بلادِ مغرب کے مصاحف میں فاء کو لکھتے وقت اس کے نیچے ایک نقطہ ڈالا جاتا ہے جبکہ ہمارے ہاں فاء کو لکھتے وقت اس کے اوپر ایک نقطہ ہوتا ہے۔ یہ علم الضبط کی مثال ہے۔[1]

قرآن مجید کی حفاظت کا اصل ذریعہ کتابت یا حفظ؟

ہر دور میں کسی شیء کو محفوظ کرنے کے ذرائع مختلف رہے ہیں۔ زمانہ قدیم میں عربوں میں علم کو محفوظ کرنے کا اصل ذریعہ حفظ تھا جیسا کہ دور جاہلیت کی عرب شاعری کو زبانی ہی محفوظ کیا گیا ہے اور زبانی ہی نقل کیا گیا ہے۔ قرون وسطی میں کتابت کو اہمیت حاصل ہوتی چلی گئی اور آج جدید دور میں کہ جسے ہم آئی ٹی کا دور کہتے ہیں، کتابت بھی متروک ہو چکی ہے اور اس کی جگہ کمپیوٹرائزیشن لے چکی ہے۔

اب ہم اپنا علم اپنی ڈائری کی بجائے اپنی ہارڈ ڈسک میں محفوظ رکھتے ہیں۔ اور اب تو کتابیں کیا، لائبریری تک ہارڈ ڈسک میں موجود ہوتی ہے۔ علوم اسلامیہ کے طلباء کے لیے اس کی بہترین مثال "المكتبة الشاملة" ہے کہ جس میں کوئی ساٹھ ہزار تک کتب جمع کی جا چکی ہیں۔ اب طلباء کتاب کی ہارڈ کاپی کی بجائے سوفٹ کاپی سے زیادہ استفادہ کرتے ہیں۔

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ہر زمانے کا علم کو محفوظ کرنے اور رکھنے کا ایک مزاج ہوتا ہے اور زمانہ قدیم میں یہ مزاج حفظ کا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کی وفات ہوئی تو سینکڑوں حفاظ موجود تھے لیکن قرآن مجید کا ایک بھی لکھا ہوا مکمل نسخہ موجود نہ تھا حتی کہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے آ کر سب سے پہلے قرآن مجید کا پہلا مکمل نسخہ تیار کروایا جو کہ ایک سرکاری نسخہ تھا۔ آپ ﷺ کے زمانے میں قرآن مجید جو کہ لکھا گیا تھا، وہ ایک جگہ جمع نہیں تھا۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں بھی قرآن مجید کا ایک سرکاری نسخہ تو تیار ہو گیا لیکن اس کی کتابی اشاعت نہیں ہوئی۔ یہاں تک کہ حضرت عمر

[1] Al-Quran Al-Kareem bi Riwayat e Warsh, Retrieved 01 November, 2016 from http://ia601606.us.archive.org/14/items/QRaaNT/QRaaNTH.pdf

بن خطاب رضی اللہ عنہ کا دورِ خلافت بھی گزر گیا اور قرآن مجید کا ایک ہی سرکاری نسخہ موجود رہا۔ پھر حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے دور میں ایک سے زائد نسخے تیار ہوئے اور وہ بھی پانچ سے زائد نہ تھے۔[1] گویا خلافت راشدہ میں قرآن مجید کے عوامی سطح پر پڑھنے کا جو عمل جاری تھا، وہ استاذ اور شاگرد کے باہمی تعلق سے جاری تھا اور قرآن مجید کو محفوظ رکھنے کا جو ذریعہ استعمال ہوا، وہ حفظ تھا۔ اسی لیے تو اللہ عزوجل نے قرآن مجید کا تعارف یہ کہہ کر کروایا کہ یہ اہل علم کے سینوں میں وہ آیات ہیں، جو واضح ہیں۔[2]

پس قرآن مجید وہی ہے جو اہل علم کے سینے میں محفوظ ہوا اور پھر سینہ بسینہ نقل ہوا ہے۔ قراء کرام نے قرآن مجید کی اسناد اور روایات کو محفوظ کیا اور آج ہر قاری قرآن کے پاس ایسی سند موجود ہے کہ وہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچنے والی ہے۔ آج بھی جبکہ پرنٹنگ پریس کا زمانہ اپنے عروج پر ہے اور مصاحف لاکھوں کی تعداد میں شائع ہو رہے ہیں، قرآن مجید میں اصل اعتبار حفظ کا کیا جاتا ہے نہ کہ کتابت کا۔

دنیا کے کسی بھی اسلامی ملک میں حکومت کی اجازت سے جو مصاحف شائع ہوتے ہیں تو ان کی تصدیق پہلے قراء کرام سے کروائی جاتی ہے۔ پاکستان کی وزارت مذہبی امور اس وقت تک کسی پبلشر کو مصحف شائع کرنے کی اجازت فراہم نہیں کرتی جب تک کہ دو قراء کرام اس مصحف کی صحت کی تصدیق نہ کر دیں۔ لہذا قرآن مجید کی نقل میں اصل قراء ہیں نہ کہ مصاحف کہ لکھے ہوئے کی تصدیق قراء اور حفاظ کر رہے ہیں۔ لکھا ہوا قرآن مجید یا مصحف اس وقت تک مستند نہیں ہے جب تک کہ اسے قراء اور حفاظ کی مہر تصدیق حاصل نہ ہو جائے۔

اور اہم تر بات یہ ہے کہ لکھے ہوئے کو پڑھنا اور صحیح پڑھنا کسی بھی زبان میں بغیر ماہر استاذ کے ممکن ہی نہیں ہے کہ ایک ہی زبان میں تلفظ اور لہجات [accents and dialects] کا فرق ہوتا ہے۔ کسی زبان میں کچھ حروف سائلنٹ ہوتے ہیں۔ انگریزی

---

[1] علي بن سليمان العبيد، الدكتور، جمع القرآن الكريم حفظا وكتابة، مجمع الملك فهد، المدينة المنورة، ص 55

[2] العنكبوت: 29: 49

زبان کا ایک ہی لفظ امریکن کسی اور طرح ادا کرتے ہیں اور برطانوی کسی اور طرح سے۔ اور بعض اوقات تو زمین وآسمان کا فرق ڈال دیتے ہیں۔ پس قرآن مجید اگر لکھا ہوا بھی ہے تو اس لکھے ہوئے کو کیسے پڑھنا ہے؟ تو اس میں پھر اصل قراء اور حفاظ ہیں۔ اگر آپ لکھے ہوئے کو ویسے ہی پڑھیں جیسا کہ وہ لکھا ہوا ہے تو قرآن مجید کے بہت سے مقامات کو غلط پڑھ جائیں گے۔ اور ان باتوں کی گہرائی سے قراء خوب واقف ہیں کہ بعض مقامات پر قراءت، ظاہری رسم کے مطابق نہیں ہو رہی ہوتی ہے۔

اس لیے قرآن مجید میں اصل نقل ہے نہ کہ کتابت، اور نقل بھی ماہرین کی نہ کہ عوام کی۔ قراء اور عوام کے قرآن مجید محفوظ رکھنے میں جو فرق ہے، وہ سب کے علم میں ہے۔ دیہات میں بوڑھی اماں جی بھی بچوں کو قرآن مجید پڑھا رہی ہوں گی اور ان کے بھی سینکڑوں شاگرد ہوں گے اور ان کے اخلاص کا اللہ کے ہاں انہیں اجر بھی ملے گا لیکن کیا ان بوڑھی اماں نے قرآن مجید کو اسی طرح سے محفوظ رکھا ہوا ہے جیسا کہ اللہ کے رسول ﷺ نماز میں تلاوت فرماتے تھے؟ تو یہ اعزاز صرف قراء کو حاصل ہے۔

کتاب وسنت کا باہمی تعلق

عرصہ ہوا کہ جناب مفتی فیصل جاپان والا کے توسط سے کراچی میں غامدی صاحب کے شاگرد معز امجد صاحب سے ایک علمی گفتگو ہوئی تھی کہ جس میں راقم کے ساتھ جناب طاہر الاسلام عسکری صاحب بھی شریک تھے۔ اس مجلس کا کل حاصل میرے لیے ایک جملے میں یہ تھا کہ معز امجد صاحب نے یہ کہا کہ میرے لیے بنیادی ترین سوال یہ ہے کہ کتاب وسنت کا باہمی تعلق کیا ہے؟

یہ امر واقعہ ہے کہ ان سے ملاقات سے پہلے میں نے اس سوال پر غور نہیں کیا تھا لیکن اس نشست کے بعد واقعتاً یہ محسوس ہوا کہ دین کے ایک سنجیدہ طالب علم کے لیے یہ بہت ہی بنیادی سوال ہے۔ اس سوال پر مطالعہ اور غور وفکر شروع کیا اور پھر اس موضوع پر کافی کچھ لکھا بھی کہ جس کا خلاصہ ذیل میں بیان کر رہا ہوں۔

سلف صالحین کا اس بارے اختلاف ہے کہ سنت، کتاب کے علاوہ کوئی دین کا مصدر

ہے یا یہ دونوں ایک ہی مصدر ہیں۔ یہ بہت باریک نکتہ ہے کہ جسے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ جمہور کا موقف یہ ہے کہ کتاب ایک علیحدہ مصدر دین ہے اور سنت ایک علیحدہ مصدر دین ہے جبکہ امام شاطبیؒ کا موقف یہ ہے کہ نہیں، کتاب وسنت ایک ہی مصدر ہے، یہ دو مصادر نہیں ہیں[1] اور امام شافعیؒ کا رجحان بھی اسی طرف معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنی ''کتاب الرسالۃ'' میں بہت سی ایسی احادیث کہ جنہیں علماء کتاب اللہ پر اضافہ سمجھتے تھے، انہیں کتاب اللہ کا بیان ثابت کیا ہے۔

اس بات کو یوں بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ جمہور کے نزدیک سنت، کتاب اللہ کے احکامات کی شرح اور بیان بھی ہے اور اس پر اضافہ بھی ہے کہ سنت میں بعض احکامات ایسے ہیں کہ جن کا ذکر قرآن مجید میں نہیں ہے۔ امام شافعیؒ کا کہنا یہ ہے کہ سنت کل کی کل، قرآن مجید کا بیان ہے۔ یعنی سنت کا کوئی حکم ایسا نہیں ہے جو کتاب اللہ کی کسی آیت کی شرح اور بیان نہ ہو۔ امام شافعیؒ نے ایسی بہت سی احادیث کو کہ جنہیں لوگ کتاب اللہ پر اضافہ سمجھتے تھے، کتاب اللہ کا بیان ثابت کیا ہے۔

راقم کی رائے اس بارے یہ ہے کہ اگرچہ موقف دونوں درست ہیں کہ اصولی طور اللہ کے رسول ﷺ ہی دین کا مصدر ہیں۔ چاہے کتاب اللہ ہو یا سنت رسول ﷺ دونوں آپ ﷺ کی ذات ہی سے صادر ہوتے ہیں۔ لہذا آپ ﷺ کی سنت کو کتاب اللہ سے علیحدہ مصدر ماننے میں کوئی شرعی مانع موجود نہیں لیکن عملی بات امام شافعیؒ کی زیادہ صحیح ہے کہ سنت، کتاب اللہ کا بیان ہے اور یہ دونوں مل کر ایک ہی مصدر ہیں۔

سنت سے مراد اللہ کے رسول ﷺ کا قول، فعل اور تقریر ہے جو حدیث میں موجود ہے۔ اس مجلس کے بعد سے راقم کے سامنے جب بھی کوئی اہم سنت آتی ہے تو فوراً ذہن قرآن مجید کی کسی آیت کی طرف منتقل ہو جاتا ہے کہ یہ سنت اس آیت کا بیان ہے۔ پس صحیح بات یہی ہے کہ آپ ﷺ نے اپنی احادیث کے ذریعے کتاب اللہ کو کھول کر بیان

[1] مصطفى بن حسني السباعي (المتوفى: 1384هـ)، السنة ومكانتها في التشريع الإسلامي، المكتب الإسلامي، دمشق، الطبعة الثالثة، 1402 هـ - 1982 م، ص 380

کیا ہے اور ہر حدیث، کسی نہ کسی آیت ہی کا بیان ہے۔

پس قرآن مجید الفاظ ہیں اور سنت ان الفاظ کا معنی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں لفظ اہم ہے اور سنت میں معنی۔ قرآن مجید میں لفظ کی حفاظت پر زور ہے اور سنت میں معنی کی۔ لفظ اور معنی کا تعلق لازم وملزوم کا ہے۔ جو لوگ سنت کا انکار کرتے ہیں، وہ صرف اللہ کے الفاظ کو قبول کرتے ہیں اور ان الفاظ سے اللہ کی مراد کو نکال کر اپنی مراد ڈال دیتے ہیں۔

قادیانیت، رافضیت، باطنیت، خوارجیت، اعتزال وغیرہ جیسی جتنی فکری گمراہیاں ہیں، سب کی بنیاد قرآن مجید ہے۔ اور قرآن مجید اسی وقت گمراہی کی بنیاد بن جاتا ہے جب اس کے الوہی معنی یعنی سنت کا انکار کر دیا جائے۔ اور پھر تو صرف الفاظ ہیں، اب آپ ان سے جو کھیل کھیلنا چاہیں، کھیل سکتے ہیں۔ اور اسی لیے خود قرآن مجید نے کہا ہے:

﴿يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا وَيَهْدِي بِهِ كَثِيرًا﴾[1]

"اس قرآن مجید کے ذریعے اللہ عزوجل بہتوں کو گمراہ کرتا ہے اور بہتوں کو اسی سے ہدایت دیتا ہے۔"

سنت اور حدیث میں فرق

ایک دوست نے پوچھا کہ کیا سنت اور حدیث میں فرق ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ دونوں میں فرق ہے۔ انہوں نے پوچھا ہے کہ ماخذ دین سنت ہے یا حدیث؟ تو اس سوال کا جواب پہلے سوال کے جواب میں موجود ہے۔ اصل سوال پہلا ہے اور پہلے سوال کا جواب صحیح تصور دین کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں کہ سلف صالحین کی اصطلاح میں سنت، اللہ کے رسول ﷺ کے قول، فعل اور تقریر کو کہتے ہیں[2] اور حدیث، اس سنت کی روایت کا نام

---

[1] البقرة: 2: 26

[2] وَأَمَّا مَعْنَاهَا شَرْعًا: أَيْ: فِي اصْطِلَاحِ أَهْلِ الشَّرْعِ فَهِيَ: قَوْلُ النبي صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَفِعْلُهُ وَتَقْرِيرُهُ [الشوكاني، محمد بن علي بن محمد بن عبد الله اليمني (المتوفى: 1250هـ)، إرشاد الفحول إلي تحقيق الحق من علم الأصول، دار الكتاب العربي، بيروت، الطبعة الأولى، 1419هـ - 1999م، 95/1]

ہے۔ پس سنت پہلے ہے اور حدیث بعد میں ہے۔ سنت آپ ﷺ کا قول، فعل اور تقریر ہے اور حدیث اس قول، فعل اور تقریر کے بیان کا نام ہے کہ جو صحابی کا ہوتا ہے۔[1] اس لیے صحیح اور ضعیف حدیث ہوتی ہے نہ کہ سنت کیونکہ سنت تو اللہ کے رسول ﷺ کا قول، فعل اور تقریر ہے تو وہ کیسے ضعیف یا موضوع ہو سکتا ہے؟ البتہ وہ حدیث ضعیف یا موضوع ہو سکتی ہے کہ جس میں سنت منقول ہو۔ سنت اور حدیث کے اس فرق کو ملحوظ نہ رکھنے کے سبب سے بہت سے لوگ بہت سی غلط فہمیوں کا شکار ہوئے ہیں۔

پس سنت مظروف ہے اور حدیث اس کا ظرف ہے۔ سنت مکین ہے اور حدیث اس کا مکان ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جب آپ اہمیت کی بات کریں گے تو اصل اہمیت مظروف اور مکین کی ہے نہ کہ ظرف اور مکان کی۔ لیکن یہ بھی واضح رہے کہ بعض اوقات مظروف اپنے ظرف سے پہچانا جاتا ہے اور مکین کا تشخص اس کا مکان بن جاتا ہے۔ لہذا دونوں کی اہمیت مسلم ہے۔

تو جہاں تک دوسرے سوال کا جواب ہے تو وہ یہی ہے کہ سلف صالحین کے نزدیک مصادر شریعت کتاب وسنت ہی ہیں نہ کہ کتاب وحدیث جیسا کہ جمیع مذاہب کی کتبِ اصول میں مصادر دین کی بحث کے تحت کتاب اللہ کے بعد سنت رسول ﷺ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اور ہمیشہ سے کتاب وسنت کی اصطلاح ہی مستعمل رہی ہے۔ کتاب سے مراد قرآن مجید ہے اور سنت سے مراد اللہ کے رسول ﷺ کا قول، فعل اور تقریر ہے۔ کتاب تو "مابین الدفتین" موجود ہے اور سنت کہاں ہے؟ یہ اہم سوال ہے کہ جس سے حدیث کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔ سنت کا صرف اور صرف ایک ہی مصدر ہے اور وہ احادیث کی کتب ہیں۔

ہمارے ہاں سنت اور حدیث میں فرق کے حوالہ سے دو غلط فہمیاں پیدا ہوئیں بلکہ

---

[1] فَحَقِيقَةُ الرِّوَايَةِ: نَقْلُ السُّنَّةِ وَنَحْوِهَا وَإِسْنَادُ ذَلِكَ إِلَى مَنْ عُزِيَ إِلَيْهِ بِتَحْدِيثٍ أَوْ إِخْبَارٍ أَوْ غَيْرِ ذَلِكَ [السيوطي، عبد الرحمن بن أبي بكر، جلال الدين (المتوفى: 911هـ)، تدريب الراوي في شرح تقريب النواوي، دار طيبة، الرياض، 26/1]

جان بوجھ کر پیدا کی گئی ہیں۔اور یہ دونوں غلط فہمیاں امین احسن اصلاحی رحمہ اللہ نے پیدا کی ہے اور اس کا سبب یہ بنا کہ حدیث ان کا میدان نہیں تھا۔یہی وجہ ہے کہ جب مولانا عطاء اللہ حنیف رحمہ اللہ کو یہ خبر پہنچی کہ امین احسن اصلاحی رحمہ اللہ یہ کہہ رہے ہیں کہ وہ تدبر قرآن کے بعد تدبر حدیث لکھ کر حدیث کی بھی خدمت کرنا چاہتے ہیں تو مولانا نے کہا کہ اللہ ان سے یہ خدمت نہ ہی لے تو بہتر ہے۔اور وجہ یہی تھی کہ حدیث امین احسن اصلاحی رحمہ اللہ کا میدان نہ تھا۔

امین احسن اصلاحی رحمہ اللہ نے سنت سے مراد اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل لیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول اور تقریر اس سے نکال دیا[1] حالانکہ اصول فقہ کی تمام کتابوں میں جمیع مکاتب فکر کے اصولیین کے نزدیک سنت کی تعریف میں فعل کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول اور تقریر بھی شامل کیا گیا ہے۔دوسری غلط فہمی جو امین احسن اصلاحی رحمہ اللہ نے پیدا کی، وہ یہ ہے کہ سنت کا مصدر احادیث کی کتابیں نہیں ہیں۔پس سنت ہمیں کہاں ملے گی؟اس کا جواب اصلاحی صاحب کے ہاں یہ نہیں ہے کہ حدیث کی کتابوں میں بلکہ اس کا جواب ان کے ہاں یہ ہے کہ سنت ہمیں "تواتر عملی" میں ملے گی۔حالانکہ اس امت میں بشمول امام مالک رحمہ اللہ کسی مذہب کے بانی کا یہ موقف نہیں رہا ہے کہ سنت ہمیں تواتر عملی میں ملے گی بلکہ سب نے اخبار آحاد ہی کو سنت کا ماخذ مانا اور قرار دیا ہے۔اصلاحی صاحب کے اس تصورِ سنت کو غامدی صاحب نے ایک جامع فکر کی صورت میں نہ صرف پیش کیا بلکہ اس کی تشہیر بھی فرمائی۔[2]

پس سنت اور حدیث میں فرق معمولی ہے اور یہ فرق ایسا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کو لازم وملزوم ہیں کہ سنت مکین ہے اور حدیث اس کا مکان ہے، سنت مظروف ہے اور حدیث اس کا ظرف ہے۔یہ سلف کی اصطلاح میں ہے کہ جب وہ سنت کو بطور مصدر شریعت بیان کرتے ہیں تو اس سے یہی مراد لیتے ہیں۔پس حدیث، سنت کا

---

[1] اصلاحی، امین احسن، مولانا، مبادی تدبر حدیث، فاران فاؤنڈیشن، لاہور، 1994ء، ص 19، 28

[2] غامدی، جاوید احمد، میزان، المورد، لاہور، 2009ء، ص 13-15

ماخذ اور مصدر ہے۔ اور سنت دین کا ماخذ اور مصدر ہے۔

تواتر عملی کی سند کہاں ہے؟

مکتب اصلاحی، فکر غامدی اور ان کے متاثرین کا کہنا ہے کہ دین، سنت میں ہے اور سنت، تواتر عملی میں ہے۔ لیکن سوال یہاں ختم نہیں ہو جاتا بلکہ یہاں سے شروع ہوتا ہے کہ تواتر عملی کی سند کہاں ہے؟ امر واقعہ یہ ہے کہ یہ لوگ صرف لفظ استعمال کرنا جانتے ہیں لیکن اس لفظ پر انہوں نے کبھی غور نہیں کیا کہ وہ کیا استعمال کر رہے ہیں؟

تواتر عملی سے مراد وہ عمل ہے جو مسلم معاشرے میں نسل در نسل اور پے در پے ہو رہا ہو۔ آج مسلم معاشرے میں جو کچھ ہو رہا ہے، چاہے وہ پے در پے ہی کیوں نہ ہو، تو وہ مستند نہیں ہے کیونکہ اکثر بدعات اور معاصی پے در پے ہی ہوتی ہیں۔ اور اگر آپ بدعات اور معاصی کو بدعت اور معصیت کا عنوان دینا بھی چاہیں گے تو خبر کی بنیاد پر ہی دیں گے۔ لہذا کسی معاصر معاشرتی عمل کو سنت ثابت کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی سند کو اللہ کے رسول ﷺ کے قدموں تک پہنچایا جائے۔

پس کسی عمل کو متواتر عملی کہنے کا مطلب یہ ہے اس عمل کو اللہ کے رسول ﷺ کے زمانے سے لے کر آج تک مسلسل ہر زمانے میں ثابت کیا جائے۔ آپ ﷺ سے لے کر آج تک تقریبا بتیس نسلیں اور چودہ صدیاں گزر چکی ہیں۔ پس ایک عمل، تواتر عملی سے ثابت ہے تو اسکا مطلب ہے کہ وہ امت مسلمہ کی تاریخ میں چودہ صدیوں میں ہر صدی میں رائج رہا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ چودہ صدیوں میں ایک عمل ہر صدی میں امت مسلمہ میں رائج رہا ہے اور میں اور آپ اس وقت چودھویں صدی میں ہیں تو ہمارے پاس پہلی تیرہ صدیوں میں جھانک کر دیکھنے کا کیا ذریعہ ہے کہ یہ عمل ان صدیوں میں بھی امت مسلمہ میں رائج تھا یا نہیں؟ اور اگر آپ یہ کہتے ہیں کہ جو چودھویں صدی میں امت میں رائج ہے، وہ سب پہلی صدی ہی سے چلا آ رہا ہے؟ تو اس سے بڑی بے وقوفی کی کوئی بات نہ ہو گی۔

ماضی کے معاشروں کا تواتر عملی جاننے کا صرف ایک ہی ذریعہ ہے، اور وہ خبر کا ذریعہ۔ اب اسے تاریخ کہہ لیں یا روایت، اس سے آپ کی جان نہیں چھوٹنے والی۔ ماضی میں کسی عمل کا تواتر علمی سے ثابت ہونا بغیر خبر کے ممکن ہی نہیں ہے۔ لہذا جو حدیث کی خبر سے بھاگے ہیں، ان کے گلے تاریخ پڑ گئی ہے۔ اور اب تواتر عملی، تاریخ سے ثابت کرنے چلے ہیں۔ تو خبر اصل ہوئی یا تواتر عملی؟

کیا اللہ کا دین صحیح اور ضعیف ہو سکتا ہے؟

یہ وہ اعتراض ہے جو اکثر منکرین حدیث کی زبانوں پر ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ اگر قرآن کی طرح حدیث بھی اللہ کا دین ہے تو اس میں صحیح اور ضعیف کا اختلاف کیوں ہے؟ ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں کہ حدیث کی طرح قرآن مجید میں بھی متواتر اور شاذ کا اختلاف موجود ہے۔

اگر آپ کے علم میں نہیں ہے تو حسن بصری متوفی 110ھ، ابن محیصن متوفی 123ھ، اعمش اسدی متوفی 148ھ اور یحی یزیدی متوفی 202ھ کی مروی قراءات دیکھ لیں۔[1] اور یہ چاروں حضرات تو اتنے معروف ہیں کہ ان کی شاذ قراءات کے مصاحف بھی پبلش ہوتے ہیں۔ لیکن جس طرح شاذ قراءات کے وجود سے قرآن مجید مشتبہ نہیں قرار پاتا، اسی طرح موضوع روایات کے موجود ہونے سے مقبول احادیث پر طعن وارد نہیں ہوتا۔

دوسری بات یہ ہے کہ احادیث کا ایک بڑا اور غالب ذخیرہ ایسا ہے کہ جس کی صحت وضعف میں اختلاف نہیں ہے اور کم احادیث ہیں کہ جن کی صحت وضعف کی بابت ائمہ سلف کا اختلاف ہوا ہے۔ اور تیسری بات یہ ہے کہ جن احادیث کی صحت وضعف میں ائمہ سلف کا اختلاف نقل ہوا ہے، وہ احادیث اصول ومبادی دین سے متعلق نہیں ہیں بلکہ جزئیات اور فروعات سے بحث کرتی ہیں لہذا دین کے اصول ومبادی کل کے کل مقبول

[1] أبو الفتح عثمان بن جني الموصلي (المتوفى: 392هـ)، المحتسب في تبيين وجوه شواذ القراءات والإيضاح عنها، وزارة الأوقاف-المجلس الأعلى للشئون الإسلامية، المملكة العربية السعودية، 1420هـ- 1999م

روایات سے ہی ثابت ہیں۔

چوتھی بات یہ ہے کہ ہم بار بار یہ واضح کر رہے ہیں کہ اللہ کا دین حدیث ہے یہ عوامی بیان ہے جبکہ علمی بیان یہ ہے کہ اللہ کا دین حدیث میں موجود ہے یعنی اللہ کا دین سنت ہے جو حدیث میں موجود ہے لہذا حدیث کے صحیح اور ضعیف ہونے کا مطلب دین کی صحت اور ضعف نہیں ہے بلکہ دین کی اپنے شارع کی طرف نسبت کا صحیح یا ضعیف ہونا ہے۔اور نسبت کا صحیح یا ضعیف ہونا کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہے۔

پانچویں بات یہ ہے کہ کسی حدیث کی صحت و ضعف میں اختلاف مخاطبین کی جہت سے ہے نہ کہ خدا کی جہت سے۔ پس اگر قرآن مجید میں موجود اللہ کے دین اور حکم تک بذریعہ فہم پہنچنے میں مجتہدین اور فقہاء کا اختلاف ہو جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ تھوڑا ہے کہ شریعتیں دو ہیں۔ ہم یہ کہیں گے کہ اللہ کا حکم ایک ہی ہے لیکن بعض فقہاء نے اس کو پالیا اور بعض نہ پا سکے۔ اور اجر و ثواب دونوں کے لیے ہے اگرچہ جس نے حکم پالیا اس کے لیے دوگنا اجر اور جس نے نہ پایا تو اس کے لیے ایک گناہ اجر ہے۔ پس جس طرح اللہ کی کتاب میں موجود حکم کو بذریعہ استدلال واستنباط پالینے میں دو رائیں ہو سکتی ہیں، اسی طرح احادیث میں موجود اللہ کے حکم کے اثبات و نفی میں بھی دو رائیں ہو سکتی ہیں۔

آخری اور چھٹی بات یہ ہے کہ جب ہم کہتے ہیں کہ اللہ کا دین کتاب اللہ اور احادیث رسول ﷺ میں محفوظ ہے تو یہ من جملہ حفاظت کی بات ہوتی ہے۔ یعنی امت کے پاس وہ احادیث موجود ہیں کہ جن میں اللہ کا حکم ہے، لہذا کسی محدث نے اپنی تحقیق سے اس حکم کو پالیا اور کوئی نہ پا سکا کہ جس طرح اللہ کی کتاب میں موجود حکم کو کسی مجتہد نے پالیا اور کوئی اس کو نہ پا سکا۔ تو جس مجتہد نے اللہ کا حکم نہ پایا تو اس نے جو پایا ہے، وہ اللہ کا حکم نہیں ہے لیکن پھر بھی اس کے لیے ایک گنا اجر ہے۔ یہ گہری بات ہے اور یہی قاعدہ محدثین کے لیے بھی جاری ہوتا ہے۔

عہد نبوی اور عہد صحابہ میں احادیث کی کتابت

آغازِ اسلام میں اللہ کے رسول ﷺ نے احادیث لکھنے سے منع فرمایا تھا کہ اس میں

کئی حکمتیں تھیں۔ایک یہ کہ لوگ ابھی تک قرآن مجید کے اسلوبِ کلام سے مانوس نہ تھے لہذا وہ قرآن مجید کے ساتھ حدیث کو خلط ملط کر دیتے تھے۔ دوسرا یہ کہ شروع اسلام میں قرآن مجید میں جن موضوعات کو زیر بحث لایا گیا، وہ عقائد، سابقہ اقوام کے قصص اور اخلاقیات تھیں کہ جن کی وضاحت کی ضرورت نہیں تھی۔ مکی سورتوں کے مضامین عموماً یہی ہیں لہذا مکہ کے ابتدائی تیرہ سالوں میں احادیث کی ضرورت نہ تھی، صرف قرآن مجید ہی کافی تھا۔شریعت مدنی سورتوں میں مدینہ میں جاکر نازل ہوئی کہ جس کی تفصیل اور وضاحت اللہ کے رسول ﷺ نے اپنی احادیث سے بیان فرمائی۔

صحیح مسلم کی ایک روایت کے مطابق شروع اسلام میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ مجھ سے قرآن کے علاوہ کچھ نہ لکھو اور جس نے قرآن مجید کے علاوہ لکھا ہے، تو وہ مٹا دے۔[1] اس کے بعد جبکہ مسلمان قرآن مجید کے اسلوب کلام سے مانوس ہو گئے اور شرعی احکام کا نزول شروع ہو گیا تو آپ ﷺ نے احادیث لکھنے کی اجازت دے دی۔

سنن ابو داؤد میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ سے سوال کیا کہ میں آپ سے بہت سی باتیں سنتا ہوں، کیا انہیں لکھ لیا کروں؟ تو آپ ﷺ نے کہا کہ ہاں! لکھ لیا کرو۔ انہوں نے کہا کہ آپ کبھی خوش ہوتے ہیں اور کبھی غصے میں ہوتے ہیں [تو کیا ہر حال میں کہی ہوئی بات لکھ لیا کروں]۔ تو آپ ﷺ نے کہا کہ ہاں، اللہ کی قسم! میری زبان سے حق کے علاوہ کچھ جاری نہیں ہوتا [چاہے میں کسی حال میں بھی ہوں]۔[2]

صحیح بخاری کی ایک روایت کے مطابق ابو شاہ یمنی رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ سے درخواست کی تھی کہ جو باتیں انہوں نے فتح مکہ کے خطبہ عام میں آپ ﷺ سے سنی ہیں، وہ انہیں لکھ کر دے دی جائیں۔تو آپ ﷺ نے صحابہ کو حکم دیا کہ ابو شاہ کو میرے خطبہ کی باتیں لکھ کر دے دو۔ اس کے علاوہ اور بہت سی احادیث ہیں کہ جن میں نبی

---

[1] مسلم بن الحجاج أبو الحسن القشيري النيسابوري (المتوفى: 261هـ)، المسند الصحيح المختصر بنقل العدل عن العدل إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم، دار إحياء التراث العربي، بيروت، كِتَابُ الزُّهْدِ وَالرَّقَائِقِ، بَابُ التَّثَبُّتِ فِي الْحَدِيثِ وَحُكْمِ كِتَابَةِ الْعِلْمِ، 2298/4

[2] أبو داود، سليمان بن الأشعث بن إسحاق الأزدي (المتوفى: 275هـ)، سنن أبي داؤد، المكتبة العصرية، بيروت، كِتَاب الْعِلْمِ، بَابٌ فِي كِتَابِ الْعِلْمِ، 318/3

ﷺ کے زمانے میں ہی صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے احادیث لکھنے کا بیان ہے۔[1] صحیح بخاری ہی کی ایک روایت کے مطابق حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے زیادہ کوئی بھی حدیث نبوی کو مجھ سے زیادہ جاننے والا نہیں تھا کیونکہ وہ آپ ﷺ کی احادیث لکھ بھی لیتے تھے اور یاد بھی کرتے تھے جبکہ میں صرف یاد رکھتا تھا اور لکھتا نہ تھا۔[2] حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ابو جحیفہ رضی اللہ عنہ نے جب یہ سوال کیا کہ کیا آپ کے پاس قرآن مجید کے علاوہ بھی وحی کا علم ہے؟ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ بس قرآن مجید کا فہم ہے اور یہ ایک صحیفہ ہے۔ تو انہوں نے پوچھا کہ اس صحیفے میں کیا ہے؟ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ دیت، قیدیوں کو چھوڑنے اور کافر کے بدلے مسلمان کو قتل نہ کرنے جیسے احکامات ہیں۔[3] پس تربیت یافتہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی ایک جماعت آپ ﷺ کے زمانے میں ہی احادیث کو لکھا کرتی تھی۔

حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ نے اللہ کے رسول ﷺ سے جو احادیث لکھی ہیں، اسے "الصحیفة الصادقة" کہتے ہیں، یہ حدیث کی پہلی کتاب تھی جو آپ ﷺ کے زمانہ میں ہی مدون ہوئی اور محدثین میں نہ صرف اس کا تذکرہ عام ہے بلکہ بہت سے محدثین اپنی کتابوں میں اس سے روایات بھی لائے ہیں۔ اسی طرح حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ کا صحیفہ اہم ہے کہ جو ان احادیث پر مشتمل ہے جو انہوں نے اللہ کے رسول ﷺ سے سنی تھی۔ اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کا صحیفہ اہم ہے کہ جو ان احادیث پر مشتمل ہے جو انہوں نے اللہ کے رسول ﷺ سے سنی تھی۔ اسی طرح ہمام بن منبہ رحمہ اللہ نے حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے جو احادیث سنی تھیں، انہیں ایک صحیفہ میں جمع کر دیا جو کہ "صحیفة همام بن منبه" کہلاتا ہے۔ یہ کل 138 احادیث ہیں، اور اس صحیفے سے امام بخاری، امام مسلم، امام احمد رحمہم اللہ جیسے جلیل القدر محدثین نے احادیث لی ہیں۔[4]

---

[1] محمد بن إسماعيل أبو عبدالله البخاري الجعفي، صحيح البخاري، دار طوق النجاة، مصر، الطبعة الأولى، 1422ھ، كِتَاب فِي اللُّقَطَةِ، بَابُ كَيْفَ تُعَرَّفُ لُقَطَةُ أَهْلِ مَكَّةَ، 125/3

[2] صحيح بخاري، كِتَابُ العِلْمِ، بَابُ كِتَابَةِ العِلْمِ، 34/1

[3] صحيح بخاري، كِتَابُ الجِهَادِ وَالسِّيَرِ، بَابُ فَكَاكِ الأَسِيرِ، 69/4

[4] محمد عجاج بن محمد تميم بن صالح بن عبد الله الخطيب، السنة قبل التدوين، دار الفكر، بيروت،

اس صحیفے کے دو قلمی نسخے، دمشق اور برلن، میں موجود ہیں کہ جن میں فرق نہیں ہے۔ معروف محقق ڈاکٹر حمید اللہ رحمہ اللہ نے صحیفہ ہمام بن منبہ کو ایڈٹ کر کے شائع کیا ہے کہ جس کا اردو ترجمہ مارکیٹ میں عام دستیاب ہے۔

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا حجیت احادیث اور آثار صحابہ کے بارے موقف

حضرت الامام رحمہ اللہ نے اپنے ہاں دین کے مصادر کی جو تعداد اور ترتیب بیان کی ہے، وہ قرآن، حدیث اور قول صحابی ہے۔ ذیل میں حدیث کے حجت ہونے اور مصدر دین ہونے کے بارے میں علامہ صیمری متوفی 436ھ اپنی سند سے امام رحمہ اللہ کا ایک قول نقل کر رہے ہیں:

أُخْبُرْنَا أَبُو الْقَاسِم عبد الله بن مُحَمَّد الْبَزَّاز قَالَ ثَنَا مكرم قَالَ ثَنَا أَحْمد بن عَطِيَّة قَالَ ثَنَا ابْن سَمَّاعَة عَن أبي يُوسُف قَالَ سَمِعت أَبَا حنيفَة يَقُول إِذا جَاءَ الحَدِيث عَن النَّبِي صلى الله عَلَيْهِ وَسلم عَن الثِّقَات أخذنَا بِهِ فَإِذا جَاءَ عَن أَصْحَابه لم نخرج عَن أقاويلهم فَإِذا جَاءَ عَن التَّابِعين زاحمتهم.[1]

"امام ابو یوسف رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کو یہ کہتے سنا ہے کہ جب ثقہ راویوں سے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث ہم تک پہنچ جائے تو ہم اس کو پکڑ لیتے ہیں۔ اور اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ سے کوئی بات ہم تک پہنچ جائے تو ہم صحابہ کے اقوال سے باہر نہیں نکلتے۔ اور جب تابعین کی بات آتی ہے تو ہم ان سے اختلاف کرتے ہیں۔"

اسی طرح امام ابن قیم رحمہ اللہ، نعیم بن حماد کی سند سے حدیث کی حجیت کے بارے میں امام صاحب کا قول نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

قَالَ نُعَيْمُ بْنُ حَمَّادٍ: ثنا ابْنُ الْمُبَارَكِ قَالَ: سَمِعْت أَبَا حَنِيفَةَ يَقُولُ:

الطبعة الثالثة، 1400 هـ - 1980م، ص 348-361

[1] الحسين بن علي بن محمد بن جعفر، أبو عبد الله الصَّيْمَري الحنفي (المتوفى: 436هـ)، أخبار أبي حنيفة وأصحابه، دار عالم الكتب، بيروت، الطبعة الثانية، 1405هـ - 1985م، ص 24

إِذَا جَاءَ عَنْ النَّبِيِّ - صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ - فَعَلَى الرَّأْسِ وَالْعَيْنِ، وَإِذَا جَاءَ عَنْ الصَّحَابَةِ نَخْتَارُ مِنْ قَوْلِهِمْ، وَإِذَا جَاءَ عَنْ التَّابِعِينَ زَاحَمْنَاهُمْ.[1]

"عبد اللہ بن مبارک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جب کوئی بات اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہمارے پاس آجائے تو وہ ہمارے سر آنکھوں پر۔ اور جب صحابہ سے کوئی بات آئے تو ہم صحابہ کے اقوال میں سے کسی ایک قول کو اختیار کر لیتے ہیں اور جب تابعین کی بات آتی ہے تو ہم ان سے اختلاف رکھتے ہیں۔"

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک صحیح حدیث مطلقاً حجت ہے بلکہ وہ تو اس قدر روایت پسند ہیں کہ حدیث تو کجا صحابہ کے اقوال کی موجودگی میں بھی اپنے اجتہاد کا اظہار کرنا درست نہیں سمجھتے ہیں۔ اور پھر جس دین کی یہ شان ہو کہ اس کے جلیل القدر ائمہ کے اقوال کی اسناد تک محفوظ ہوں، تو عجب نہیں ہے کہ کچھ لوگ اس دین کے پیغمبر کے اقوال کے بارے شکوک وشبہات پیدا کر رہے ہوں۔

اور امام صاحب کے نزدیک صحیح حدیث وہی ہے جو کہ ثقہ راویوں سے مروی ہو جیسا کہ محدثین کے ہاں بھی حدیث کی صحت کا یہی معیار مقرر ہے۔ لہٰذا اس حوالے سے فقہاء اور محدثین کے منہج میں کوئی فرق نہیں ہے۔ فقہاء سے ہماری مراد متاخرین نہیں بلکہ بانیانِ مذاہب ہیں۔

خبر واحد سے دین کا قطعی علم ثابت ہوتا ہے

قرآن مجید اور احادیث دونوں اللہ کا دین ہے۔ اللہ نے اپنے دین کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے نہ کہ صرف قرآن مجید کی حفاظت کا۔ یہ دین ہمیں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے قطعی خبر کے ذریعے ملا ہے۔ جس طرح قرآن مجید کی خبر قطعی ہے، اسی طرح احادیث کی خبر بھی قطعی ہے کیونکہ قرآن مجید اور احادیث ایک ہی ذریعہ سے اس امت کو منتقل ہوئے

[1] ابن قيم الجوزية، محمد بن أبي بكر بن أيوب بن سعد شمس الدين (المتوفى: 751هـ)، إعلام الموقعين عن رب العالمين، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى، 1411هـ - 1991م، 94/4

ہیں اور وہ ذریعہ "خبر قطعی" کا ہے۔

اور جس طرح فتنہ پروروں نے احادیث وضع کی ہیں، اسی طرح قرآن مجید بھی گھڑا گیا۔ جس طرح احادیث کی خبر میں "موضوع" اور "صحیح" کی مصطلحات موجود ہیں، اسی طرح قرآن مجید میں بھی "شاذ" اور "متواتر" کی اصطلاحات موجود ہیں۔[1] جس طرح محدثین نے احادیث میں "صحیح" کو "موضوع" سے جدا کیا، اسی طرح قراء کرام نے "متواتر" کو "شاذ" سے ممیز کیا۔

جس طرح احادیث میں طبقات المحدثین ہیں، اسی طرح قرآن مجید میں طبقات القراء ہیں۔[2] جس طرح احادیث کی خبر کی صحت کی شرائط منقول ہیں جو کہ عام طور محدثین کے نزدیک پانچ ہیں، اسی طرح قرآن مجید کی خبر کی صحت کی بھی شرائط منقول ہیں جو عام طور قراء کے نزدیک تین ہیں کہ جن کا ذکر ہم ایک مستقل مقالہ میں کر چکے ہیں جبکہ تفصیل کے لیے علامہ ابن الجزری ؒ کی "منجد المقرئين ومرشد الطالبين" دیکھی جا سکتی ہے۔[3] جس طرح حدیث کی صحت کے اصول، اصولِ حدیث کی کتابوں میں منقول ہیں، اسی طرح قرآن مجید کی صحت کے اصول، علومِ قرآن کی کتب میں مذکور ہیں۔ پس جس طرح حدیث سند سے نقل ہوئی ہے، اسی طرح قرآن مجید بھی سند سے نقل ہوا ہے۔

اس موضوع پر کچھ دوستوں سے ہمارا ایک مکالمہ ہوا تھا کہ خبر واحد سے ثابت شدہ دین قطعی ہوتا ہے یا ظنی۔[4] ہمارا موقف یہ ہے کہ خبر واحد سے قطعی دین ثابت ہوتا ہے

---

[1] السيوطي، عبد الرحمن بن أبي بكر، جلال الدين (المتوفى: 911هـ)، الإتقان في علوم القرآن، الهيئة المصرية العامة للكتاب، مصر، 1394هـ/ 1974 م، 258/1

[2] جیسا کہ طبقات القراء کے بیان میں علامہ ابن الجزری رحمہ اللہ کی کتاب "غاية النهاية في طبقات القراء" اور امام ذہبی رحمہ اللہ کی کتاب "معرفة القراء الكبار على الطبقات والأعصار" معروف ہیں۔

[3] ابن الجزري، شمس الدين أبو الخير محمد بن محمد بن يوسف (المتوفى: 833هـ)، منجد المقرئين ومرشد الطالبين، دار الكتب العلمية، الطبعة الأولى، 1420هـ -1999م، ص 18

[4] یہ مکالمہ راقم اور مولانا زاہد صدیق مغل صاحب کے مابین فیس بک پر ہوا تھا۔ اس مکالمے میں اگرچہ بعد دوسرے حضرات کے کمنٹس بھی آ گئے جیسا کہ جناب قاری حنیف ڈار صاحب، جناب عمار خان ناصر صاحب، جناب ڈاکٹر خضر یاسین صاحب، جناب محمد حسن صاحب،

کہ یہی سلف صالحین کا موقف ہے۔ سرِ دست اس مکالمے کے چند نکات یہاں رکھ رہا ہوں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ خبر واحد، حدیث کے مترادف ہے اور حدیث کو خبر متواتر اور خبر واحد میں تقسیم کرنا بے کار کی تقسیم ہے۔ متواتر کی اصطلاح سے قطع نظر عملی صورت حال یہ ہے کہ ذخیرہ حدیث میں صرف ایک حدیث ایسی ہے کہ جسے محدثین نے متواتر مانا ہے بقیہ سب اخبار آحاد ہی ہیں لہذا ایک حدیث کے لیے اصطلاح وضع کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ اسی طرح متواتر کی اصطلاح سلف صالحین کی نہیں ہے، نہ ہی ائمہ اربعہ نے اسے استعمال کیا ہے۔ یہ یونانی اصطلاح ہے جو منطق کے رستے اصول فقہ میں داخل ہوئی۔ ہمارے سلف اس اصطلاح سے ناواقف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امام ابن الصلاح رحمہ اللہ نے اصول حدیث کی معروف کتاب "معرفة أنواع علوم الحديث" جو کہ مقدمہ ابن الصلاح کے نام سے بھی معروف ہے، میں لکھا ہے کہ متواتر محدثین کی اصطلاح نہیں ہے بلکہ یہ منطق کے رستے اصول فقہ میں آئی ہے اور وہاں سے خطیب بغدادی رحمہ اللہ نے اسے اصول حدیث میں داخل کیا ہے۔[1]

دیکھیں! خبر کو متواتر اور آحاد میں تقسیم کرنے میں ہمیں اعتراض نہیں کہ "لا مشاحة في الاصطلاح" یعنی اصطلاح بنانے میں کنجوسی سے کام نہیں لینا چاہیے۔ لیکن اگر آپ یہ کہیں کہ اس تقسیم کا مقصود یہ ہے کہ متواتر سے قطعی دین ثابت ہوتا ہے اور

مولانا سرفراز فیضی صاحب، جناب شکیل بن حسن صاحب، جناب محمد امجد مغل صاحب وغیرہ لیکن اصلاً یہ میرے اور زاہد مغل صاحب کے مابین ہی رہا ۔ یہ مکالمہ مولانا زاہد صدیق مغل صاحب کی وال پر موجود ہے۔ میں نے وہاں سے بعینہ اٹھا کر اس کی امیج بنا کر اپنی وال پر تصویر کے طور پبلش کر دیا ہے۔ اور یہ 32 صفحات پر مشتمل ہے۔

[1] وَمِنَ الْمَشْهُورِ: الْمُتَوَاتِرُ الَّذِي يَذْكُرُهُ أَهْلُ الْفِقْهِ وَأُصُولِهِ، وَأَهْلُ الْحَدِيثِ لَا يَذْكُرُونَهُ بِاسْمِهِ الْخَاصِّ الْمُشْعِرِ بِمَعْنَاهُ الْخَاصِّ، وَإِنْ كَانَ الْحَافِظُ الْخَطِيبُ قَدْ ذَكَرَهُ، فَفِي كَلَامِهِ مَا يُشْعِرُ بِأَنَّهُ اتَّبَعَ فِيهِ غَيْرَ أَهْلِ الْحَدِيثِ، وَلَعَلَّ ذَلِكَ لِكَوْنِهِ لَا تَشْمَلُهُ صِنَاعَتُهُمْ، وَلَا يَكَادُ يُوجَدُ فِي رِوَايَاتِهِمْ، فَإِنَّهُ عِبَارَةٌ عَنِ الْخَبَرِ الَّذِي يَنْقُلُهُ مَنْ يَحْصُلُ الْعِلْمُ بِصِدْقِهِ ضَرُورَةً، وَلَا بُدَّ فِي إِسْنَادِهِ مِنِ اسْتِمْرَارِ هَذَا الشَّرْطِ فِي رُوَاتِهِ مِنْ أَوَّلِهِ إِلَى مُنْتَهَاهُ. وَمَنْ سُئِلَ عَنْ إِبْرَازِ مِثَالٍ لِذَلِكَ فِيمَا يُرْوَى مِنَ الْحَدِيثِ أَعْيَاهُ تَطَلُّبُهُ. [ابن الصلاح، عثمان بن عبد الرحمن، أبوعمرو، تقي الدين (المتوفى: 643هـ)، معرفة أنواع علوم الحديث، ويُعرف بمقدمة ابن الصلاح، دار الفكر المعاصر، بيروت، 1406هـ - 1986م، ص 267-268]

آحاد سے ظنی، تو پھر ہم یہی کہیں گے کہ یہ تقسیم سلف سے دکھائیں کیونکہ اب آپ اس تقسیم کے ذریعے دین کو تقسیم کر رہے ہیں۔ آپ کی حدیث کا کل ذخیرہ ہے ہی خبر واحد۔ متواتر تو ایک اصطلاح ہے، بس! کہ جس کا اطلاق ڈھونڈے کو نہیں ملتا۔ محدثین کو صرف ایک روایت ملی ہے کہ جسے متواتر کہہ سکیں۔ ایک روایت کے لیے اصطلاح بنانے کی کیا ضرورت ہے؟ اس لیے خبر واحد برابر ہے حدیث کے، یہ کہنا ٹھیک ہے کیونکہ کل ذخیرہ احادیث ہے ہی خبر واحد۔ خبر واحد اور متواتر میں حدیث کی تقسیم کے رستے دراصل حدیث سے ثابت شدہ دین کو ظنی قرار دیا جاتا ہے۔ اور یہ رویہ ہماری نظر میں خطرناک ہے۔

تواتر، تواتر، تواتر، ایک رانگ نمبر ہے، جس پر ابھی تک کسی کی کال نہیں ملی۔ اگر کسی کی کال ملی ہو تو صرف اتنا بتلا دے کہ کتنے ہوں تو تواتر حاصل ہوتا ہے؟ بس جس دن یہ بتلا دیا گیا کہ اتنوں سے تواتر حاصل ہوتا ہے، اس دن کال مل گئی۔ کچھ نے کہا کہ تواتر چار سے حاصل ہوتا ہے، کچھ نے پانچ، کچھ نے سات، کچھ نے دس، کچھ نے بارہ، کچھ نے چالیس، کچھ نے ستر اور کچھ نے تین سو تیرہ وغیرہ کا بھی ذکر کیا ہے۔ اسی لیے امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جمہور کا موقف یہ ہے کہ متواتر وہ ہے کہ جس سے علم قطعی حاصل ہو اور اس میں تعداد کا کوئی عمل دخل نہیں ہے کہ بعض اوقات خبر واحد سے بھی علم قطعی حاصل ہو جاتا ہے لہذا صحیحین کی اکثر روایات متواتر ہیں اور بعض اوقات جم غفیر کی خبر کا بھی کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔[1] خدا کے دین میں ذریعہ ثبوت کے اعتبار سے

---

[1] وَأَمَّا الْمُتَوَاتِرُ فَالصَّوَابُ الَّذِي عَلَيْهِ الْجُمْهُورُ: أَنَّ الْمُتَوَاتِرَ لَيْسَ لَهُ عَدَدٌ مَحْصُورٌ بَلْ إذَا حَصَلَ الْعِلْمُ عَنْ إخْبَارِ الْمُخْبِرِينَ كَانَ الْخَبَرُ مُتَوَاتِرًا وَكَذَلِكَ الَّذِي عَلَيْهِ الْجُمْهُورُ أَنَّ الْعِلْمَ يَخْتَلِفُ بِاخْتِلَافِ حَالِ الْمُخْبِرِينَ بِهِ. فَرُبَّ عَدَدٌ قَلِيلٌ أَفَادَ خَبَرُهُمْ الْعِلْمَ بِمَا يُوجِبُ صِدْقَهُمْ وَأَضْعَافُهُمْ لَا يُفِيدُ خَبَرُهُمْ الْعِلْمَ؛ وَلِهَذَا كَانَ الصَّحِيحُ أَنَّ خَبَرَ الْوَاحِدِ قَدْ يُفِيدُ الْعِلْمَ إذَا احْتَفَتْ بِهِ قَرَائِنُ تُفِيدُ الْعِلْمَ. وَعَلَى هَذَا فَكَثِيرٌ مِنْ مُتُونِ الصَّحِيحَيْنِ مُتَوَاتِرُ اللَّفْظِ عِنْدَ أَهْلِ الْعِلْمِ بِالْحَدِيثِ وَإِنْ لَمْ يَعْرِفْ غَيْرُهُمْ أَنَّهُ مُتَوَاتِرٌ؛ وَلِهَذَا كَانَ أَكْثَرُ مُتُونِ الصَّحِيحَيْنِ مِمَّا يَعْلَمُ عُلَمَاءُ الْحَدِيثِ عِلْمًا قَطْعِيًّا أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَهُ تَارَةً لِتَوَاتُرِهِ عِنْدَهُمْ وَتَارَةً لِتَلَقِّي الْأُمَّةِ لَهُ بِالْقَبُولِ. وَخَبَرُ الْوَاحِدِ الْمُتَلَقَّى بِالْقَبُولِ يُوجِبُ الْعِلْمَ عِنْدَ جُمْهُورِ الْعُلَمَاءِ مِنْ أَصْحَابِ أَبِي حَنِيفَةَ وَمَالِكٍ وَالشَّافِعِيِّ وَأَحْمَد وَهُوَ قَوْلُ أَكْثَرِ أَصْحَابِ الْأَشْعَرِيِّ كالإسفراييني وَابْنِ فورك؛ فَإِنَّهُ وَإِنْ كَانَ فِي نَفْسِهِ لَا يُفِيدُ إلَّا الظَّنَّ؛ لَكِنْ لَمَّا اقْتَرَنَ بِهِ إجْمَاعُ أَهْلِ الْعِلْمِ بِالْحَدِيثِ عَلَى تَلَقِّيهِ بِالتَّصْدِيقِ كَانَ

قرآن مجید اور حدیث کے ذریعہ میں کوئی فرق نہیں رکھا گیا کیونکہ دونوں دین ہیں۔ دونوں سند سے نقل ہوئے ہیں۔ دونوں سند ہی سے حجت قرار پاتے ہیں۔ دونوں سند ہی کی بنیاد پر قطعی ہیں۔

باقی صحیح موقف یہ ہے کہ قرآن بھی قطعی ذریعے سے ثابت ہے اور حدیث بھی۔ اور وہ قطعی ذریعہ سند ہے۔ نمبروں کے کھیل کا تعلق اس تصورِ دین سے ہے جسے انسانوں نے بنایا ہے۔ اگر نمبروں کی گیم اتنی ہی اہم ہوتی تو اللہ عزوجل قرآن مجید میں ہی امت کو حکم دے دیتے کہ جب تک چار، دس، سترہ، تیس، چالیس، ستر، سو، تین سو تیرہ وغیرہ جتنی تعداد سے قرآن نہ سن لینا، اس وقت تک اس کے قرآن ہونے پر ایمان نہ لانا۔ جن لوگوں نے متواتر کی اصل تعداد کو بنایا ہے، وہ آج تک یہ واضح نہ کر سکے کہ چار سے تواتر حاصل ہوتا ہے، دس سے، سترہ سے، تیس سے، چالیس سے، ستر سے، سو سے، تین سو تیرہ سے، کتنوں سے؟ پھر تواتر کے لیے مطلوب تعداد کے اثبات کے لیے جو دلائل بیان کیے گئے ہیں، وہ بھی مذاق ہی ہیں جیسا کہ جن لوگوں کا قول ہے کہ پانچ سے تواتر حاصل ہوتا ہے تو انہوں نے کہا کہ اس کی دلیل یہ ہے کہ الوالعزم رسول پانچ ہیں۔ جنہوں نے کہا کہ سات سے تواتر حاصل ہوتا ہے تو انہوں نے کہا کہ اس کی دلیل یہ ہے کہ اصحاب کہف سات تھے۔ جنہوں نے کہا کہ دس سے تواتر حاصل ہوتا ہے تو ان کی دلیل یہ ہے کہ جمع قلت کے لیے کم از کم دس افراد کا ہونا شرط ہے۔ جنہوں نے کہا کہ بارہ سے تواتر

بِمَنْزِلَةِ إِجْمَاعِ أَهْلِ الْعِلْمِ بِالْفِقْهِ عَلَى حُكْمٍ مُسْتَنِدِينَ فِي ذَلِكَ إلَى ظَاهِرٍ أَوْ قِيَاسٍ أَوْ خَبَرٍ وَاحِدٍ فَإِنَّ ذَلِكَ الْحُكْمَ يَصِيرُ قَطْعِيًّا عِنْدَ الْجُمْهُورِ وَإِنْ كَانَ بِدُونِ الْإِجْمَاعِ لَيْسَ بِقَطْعِيٍّ؛ لِأَنَّ الْإِجْمَاعَ مَعْصُومٌ فَأَهْلُ الْعِلْمِ بِالْأَحْكَامِ الشَّرْعِيَّةِ لَا يَجْمَعُونَ عَلَى تَحْلِيلِ حَرَامٍ وَلَا تَحْرِيمِ حَلَالٍ كَذَلِكَ أَهْلُ الْعِلْمِ بِالْحَدِيثِ لَا يُجْمِعُونَ عَلَى التَّصْدِيقِ بِكَذِبٍ وَلَا التَّكْذِيبِ بِصِدْقِ. وَتَارَةً يَكُونُ عِلْمُ أَحَدِهِمْ لِقَرَائِنَ تَحْتَفُ بِالْأَخْبَارِ تُوجِبُ لَهُمْ الْعِلْمَ وَمَنْ عَلِمَ مَا عَلِمُوهُ حَصَلَ لَهُ مِنْ الْعِلْمِ مَا حَصَلَ لَهُمْ. [ابن تيمية، تقي الدين أبو العباس أحمد بن عبد الحليم الحراني (المتوفى: 728هـ)، مجموع الفتاوى، مجمع الملك فهد، المملكة العربية السعودية، 1416هـ/1995م، 18/40-41]

حاصل ہوتا ہے تو انہوں نے کہا کہ بنی اسرائیل کے نقباء کی تعداد بارہ تھی۔ اور جنہوں نے کہا کہ چالیس سے تواتر حاصل ہوتا ہے تو ان کی دلیل یہ ہے کہ جمعہ قائم کرنے کے لیے چالیس افراد کا ہونا معتبر ہے۔ جنہوں نے کہا کہ ستر افراد سے تواتر حاصل ہوتا ہے تو ان کی دلیل یہ ہے کہ حضرت موسی علیہ السلام نے اللہ عزوجل سے ملاقات کے لیے اپنی قوم میں سے ستر افراد کا انتخاب کیا تھا۔ اور جنہوں نے کہا کہ تین سو تیرہ کی تعداد سے تواتر حاصل ہوتا ہے تو ان کی دلیل یہ ہے کہ اصحاب بدر کی تعداد اتنی تھی۔ اور جنہوں نے کہا کہ سات یا چودہ سو سے تواتر حاصل ہوتا ہے تو انہوں نے کہا کہ بیعت رضوان میں اتنے صحابہ تھے وعلی ہذا القیاس۔[1]

اگر خبر واحد سے دین کی قطعیت ثابت نہ ہوتی تو اللہ عزوجل ہر قوم کی طرف ایک رسول کیوں بھیجتے؟ اور رسول کی طرف وحی بھی ایک ہی فرشتہ کیوں لے کر آتا؟ پس اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر جو کہ آپ نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو دی ہے، متواتر ہے، اس معنی میں کہ اس سے علم قطعی حاصل ہوتا ہے کہ قرآن مجید بھی اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر واحد ہی ہے۔

تواتر اگر محض انفارمیشن کے لیے ایک اصطلاح ہے تو ہمیں اصطلاحات سے کوئی مسئلہ نہیں ہے جیسا کہ خبر واحد کو تین حصوں مین تقسیم کر دیں: غریب، عزیز اور مشہور۔ لیکن اگر آپ کی اصطلاح سے تصورِ دین بگڑنے لگے تو ہم اس وقت اس اصطلاح کا رد کریں گے۔ لوگوں نے تواتر کی یونانی اصطلاح سے اللہ کے دین کو تقسیم کر دیا۔ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کو تقسیم کر دیا۔ قطعی کو ظنی بنا دیا۔

ایک ایسے دور میں بیٹھ کر قرآن مجید کے متواتر ہونے کی باتیں کرنا جبکہ مصاحف لاکھوں کی تعداد میں شائع ہو رہے ہوں، اور بات ہے۔ اور تابعین کے دور میں پہنچ کر یہ بات ثابت کرنا کہ انہیں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے قرآن مجید تواتر سے ملا ہے، اور بات ہے۔ وہاں تو ایک دوسرے کی قرآن کی وجہ سے تکفیر ہو رہی تھی۔ صحیح بخاری کی روایت کے

[1] إرشاد الفحول إلي تحقيق الحق من علم الأصول: 1/132-133

مطابق حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں آذر بائیجان اور آرمینیہ کے محاذوں پر سپاہیوں میں قرآن مجید پڑھنے کے بارے جو اختلاف ہوا تھا تو سپہ سالار حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو خط لکھ کر اس اختلاف کی اطلاع دیتے ہوئے کہا تھا کہ یہ اللہ کی کتاب میں اختلاف کر رہے ہیں لہذا ان کو کسی بات پر جمع کر دیں۔[1] اس کے بعد جمع عثمانی کا معاملہ ہوا۔ پس خلاصہ یہ ہے کہ اگر تواتر سے مراد قطعیت ہے تو ہم اس کے قائل ہیں کہ قرآن مجید اور حدیث دونوں متواتر ہیں اور اگر مراد تعداد ہے تو آپ بیان کر دیں۔

تابعین کے دور میں اگر قرآن مجید کی کسی آیت کی تحقیق کے لیے کسی کو مکہ یا مدینہ نہیں جانا پڑا تو کسی حدیث کی تحقیق کے لیے بھی نہیں جانا پڑا۔ خلافت راشدہ میں جب ایک تابعی ایک صحابی سے قرآن مجید سنتے تھے، تو اس کے قرآن مجید ہونے کا ایمان رکھتے تھے۔ یہ نہیں تھا کہ جب تک ایک تابعی صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے جم غفیر سے قرآن مجید نہیں سن لیتا تھا تو اس وقت تک اسے قرآن مجید نہیں مانتا تھا۔ خیر القرون کے بعد جب تحقیق کا دور شروع ہوا تو قرآن اور حدیث دونوں کی تحقیق ہوئی۔ طبقات المحدثین مرتب ہوئیں تو طبقات القراء بھی لکھی گئی۔ جب احادیث کی چھانٹی ہوئی تو قرآن بھی چھانٹ کر مرتب ہوا، اسی لیے تو موضوع، شاذ، ضعیف اور حسن قراءات وجود میں آئیں۔[2] یہ تو تاریخ قرآن کے موضوع کی بہت ہی بنیادی بات ہے۔ باقی ہمیں یہ فرق ضرور کرنا چاہیے کہ قرآن مجید کے نقل میں تلقی و تلاوت تھی جبکہ حدیث میں تحمل واداء۔ تلقی و تلاوت میں الفاظ اصل ہیں جبکہ تحمل واداء میں معنی کی اہمیت ہے۔ حدیث میں نہ تلقی تھی اور نہ ہی تلاوت۔ البتہ قرآن مجید اور حدیث دونوں کے منتقل ہونے کا ذریعہ ایک ہی تھا اور وہ قطعی سند تھی۔

ایک اور طرح سے بات کو سمجھیں تو یوں ہے کہ خبر میں دو پہلو ہوتے ہیں؛ جھوٹ

---

[1] أَنَّ حُذَيْفَةَ بْنَ اليَمَانِ، قَدِمَ عَلَى عُثْمَانَ وَكَانَ يُغَازِي أَهْلَ الشَّأْمِ فِي فَتْحِ أَرْمِينِيَةَ، وَأَذْرَبِيجَانَ مَعَ أَهْلِ العِرَاقِ، فَأَفْزَعَ حُذَيْفَةَ اخْتِلاَفُهُمْ فِي القِرَاءَةِ، فَقَالَ حُذَيْفَةُ لِعُثْمَانَ: يَا أَمِيرَ المُؤْمِنِينَ، أَدْرِكْ هَذِهِ الأُمَّةَ، قَبْلَ أَنْ يَخْتَلِفُوا فِي الكِتَابِ اخْتِلاَفَ اليَهُودِ وَالنَّصَارَى [صحيح البخاري: 183/6]

[2] الإتقان في علوم القرآن: 1/258-281

اور سچ۔ جب ایک پہلو متعین ہو جائے تو اسے کہتے ہیں کہ خبر قطعی ہو گئی ہے یعنی دوسرا پہلو قطع ہو گیا، ختم ہو گیا۔ اور قطعیت کے لیے تعداد کا ہونا ضروری نہیں ہے، بس یہی ہمارا مقدمہ ہے۔ مثال کے طور آج میرے لیے امام مالک رحمہ اللہ کی الموطا کی خبر قطعی ہے کہ اس کے قلمی نسخے موجود ہیں۔ امام مالک رحمہ اللہ کے لیے امام نافع رحمہ اللہ کی خبر قطعی ہے۔ امام نافع رحمہ اللہ کے لیے عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی خبر قطعی ہے۔ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے لیے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر قطعی ہے۔

پس میں تواتر کو مان رہا ہوں، لیکن یہ کہہ رہا ہوں کہ اس میں تعداد اصل نہیں ہے۔ اگر آپ تعداد کو نکال دیں تو مجھ میں اور آپ میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ لیکن اگر آپ تعداد پر حساس ہیں تو تعداد پھر آپ ہی بیان کریں گے کہ جس سے تواتر حاصل ہوتا ہے اور اس تعداد سے تواتر حاصل ہونے کی عقلی و نقلی دلیل بھی آپ کے ذمے ہے۔ اگر آپ کے نزدیک تعداد بھی تواتر کے مفہوم میں شامل ہے تو فرق یہ پڑے گا کہ میرے نزدیک تواتر ایک سے بھی حاصل ہو جائے گا جبکہ آپ کے نزدیک اس تعداد سے حاصل ہو گا جو آپ لوگ بیان کریں گے۔ پس ہمارے نزدیک تواتر سے مراد قطعیت ہے نہ کہ تعداد، لہذا امام مالک عن نافع عن عبد اللہ بن عمر ایک متواتر خبر ہے۔ یہ کہنے والا میں پہلا نہیں ہوں۔

خلاصہ یہ ہوا کہ خبر واحد اور متواتر کی تقسیم ہماری نہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ تواتر سے مراد قطعیت ہو تو صحیح اصطلاح ہے، اگر تعداد ہو تو لایعنی مصطلح ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ قطعیت، خبر کا خاصہ ہو یا مخاطب کا فیصلہ دونوں صورتوں میں ایک کی خبر سے بھی قطعیت حاصل ہو جاتی ہے۔ چوتھی بات یہ ہے کہ خبر تحقیق سے پہلے ظن کا فائدہ دیتی ہے اور تحقیق کے بعد یقین کا۔ بس جسے آپ خبر واحد کہتے ہیں، وہ ہر حال میں قطعی نہیں ہوتی، تحقیق کے بعد قطعی ہوتی ہے۔ پانچویں بات یہ ہے کہ کچھ اخبار آحاد ایسی ہیں جو تحقیق کے بغیر ہی قطعی ہیں اور یہی صحیح معنوں میں متواتر اخبار ہیں جیسا کہ مالک عن نافع عن ابن عمر۔ چھٹی بات یہ ہے کہ وہ خبر واحد جو کہ محتف بالقرائن ہو جیسا

کہ صحیحین کی خبر واحد ہے یا جس خبر واحد کو تلقی بالقبول حاصل ہو تو یہ بھی عامی کے لیے بغیر تحقیق کے قطعی ہے اور صحیح معنی میں یہ بھی متواتر اخبار ہی ہیں۔ ساتویں بات یہ ہے کہ قرآن مجید کیسے ثابت ہو گا، یہ بھی قرآن ہی بیان کرے گا، کیونکہ یہ دین کا سب سے بنیادی موضوع ہے۔ قرآن نے ہمیں یہ کہا ہے کہ اللہ کی کتاب جب تمہیں ایک شخص سے بھی پہنچے تو تم تحقیق کے بعد اس کو قبول کر لو۔ بس اس کے بعد ہمیں کسی خارجی ذریعہ کی ضرورت نہیں ہے۔

اور یہ دعوی درست نہیں ہے کہ قرآن مجید کے اثبات کے لیے سند کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ قرآن مجید کی بیس روایات میں سے کوئی ایک روایت بھی بغیر سند کے ثابت کر دیں۔ باقی قرآن کی اسناد کے لیے علامہ ابن الجزری رحمہ اللہ کی "النشر في القرءات العشر" دیکھ لیں۔[1] اب چونکہ قراء نے کتابوں میں اسناد نقل کر دی ہیں تو متاخرین کو ضرورت نہیں ہے کہ اسناد پڑھیں پڑھائیں۔ ورنہ علمی طور تو قرآن مجید جہاں بھی پڑھیں گے، اگر روایت حفص بھی پڑھیں تو استاد جی، چاہے حنفی ہوں یا اہل حدیث، شافعی ہوں یا مالکی، پہلے یہ بتائیں گے کہ یہ روایت حفص بھی "شاطبیہ" کے طریق سے ہے یا "طیبہ" کے طریق سے۔

اور آج بھی شائع شدہ قرآن، قاری قرآن کی تصدیق کا محتاج ہوتا ہے۔ اور جب تک قاری صاحب تصحیح کا سرٹیفکیٹ نہ دے دیں، اس وقت تک قرآن مجید شائع نہیں ہو سکتا۔ تو اصل قاری صاحب ہیں نہ کہ لکھا ہوا۔ اور قرآن بھی تو بیس روایات میں سے ایک روایت ہے، یعنی روایت حفص۔ پس جسے آپ قرآن کہتے ہیں، علمی زبان میں وہ قراءتِ عاصم اور روایتِ حفص ہے۔ باقی آج سند کی ضرورت نہ قرآن مجید کے لیے اس طرح ہے، نہ حدیث کے لیے۔ دورِ تدوین کے بعد تو سند ایک اعزاز ہے۔

علاوہ ازیں اس بات کو یوں بھی سمجھ سکتے ہیں کہ کیا صحابہ کے لیے خبر واحد سے

---

[1] ابن الجزري، شمس الدين أبو الخير، محمد بن محمد بن يوسف (المتوفى : 833 هـ)، النشر في القراءات العشر، المطبعة التجارية الكبرى، مصر، 58-198

ثابت شدہ شریعت قطعی تھی اور ہمارے لیے ظنی؟ آپ ﷺ کی مجلس میں جب ایک صحابی کسی حدیث کو سنتا اور اپنے گھر، محلے اور قبیلے میں جا کر وہ حدیث بتلاتا تو کیا مخاطبین کے لیے قطعی دین ثابت ہو رہا تھا یا ظنی؟ اسی طرح اگر اکیلا صحابی قرآن مجید کی تدوین سے پہلے اپنے شہر کے لوگوں کو قرآن مجید پڑھائے تو وہ تو قطعی ہے اور اگر حدیث بتلائے تو وہ ظنی ہے؟ پس ایسا نہیں ہے کہ واسطہ بڑھ جانے سے ایک چیز قطعی سے ظنی بن جائے کہ قطعیت شیء کا خاصہ ہے نہ کہ واسطے کا۔ اور اسی طرح ایسا بھی نہیں ہے کہ قرآن مجید کو ایک شخص نقل کرے تو وہ تو قطعی کہلائے لیکن حدیث کو ایک شخص نقل کرے تو وہ ظنی کہلائے۔

ایک صحابی جب اللہ کے رسول ﷺ سے قرآن مجید کی آیات یا کوئی سورت سیکھتے تھے اور اپنے گھر میں اپنی اہلیہ کو جا کر سناتے تھے تو ان کی اہلیہ کے لیے قرآن مجید کی وہ آیات یا سورت اسی قطعیت کے ساتھ ثابت ہو رہی تھی جس قطعیت کے ساتھ اس صحابی رسول ﷺ کے لیے۔ مانا کہ نبی کریم ﷺ کے زمانے میں خبر واحد کی صورت میں ملنے والے قرآن مجید کے بارے لوگ آپ ﷺ سے تصدیق کر سکتے تھے کہ یہ قرآن مجید ہے بھی یا نہیں لیکن کیا کسی نے ایسی تصدیق کی؟ پس یہ کہنا کہ یہ ہو سکتا تھا، فلاں کر سکتے تھے، تو بھئی! ہو سکتا تھا، کر سکتے تھے، کوئی دلیل ہے کیا؟ کیا ہوا ہے، وہ بیان کریں۔ ورنہ تو ہر صحابی کا ہر فعل حجت بن جائے گا۔ پس قرون اولی میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے لیے جس ذریعہ سے قرآن مجید ثابت ہوتا تھا، اسی سے حدیث بھی ثابت ہوتی تھی۔ ہمارے لیے بھی ایسا ہی ہے۔ اور وہ ذریعہ سند ہے، بس!

اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اگر دو چار روایات میں ایک دوسرے سے روایت کو قبول نہیں کیا تو اس سے زیادہ مرتبہ ایک دوسرے سے قرآن کو بھی قبول نہ کیا۔ آرمینیہ اور آذر بائیجان کی جنگوں میں ایک دوسرے کے قرآن ہی کا تو انکار ہو رہا تھا۔ تو کیا اس انکار سے قرآن مجید ظنی ہو گیا تھا؟ ہر گز نہیں! آپ پہلے قطعی کا مفہوم ہضم کر لیں اور اس پر غور کر لیں کہ قطعیت خبر کا خاصہ ہے یا مخاطب کا فیصلہ۔ ہم نے یہ نہیں کہا کہ قطعی اور

ظنی کی تقسیم نہیں ہے۔ ہم نے یہ کہا ہے کہ یہ کہنا غلط ہے کہ قرآن مجید قطعی اور حدیث ظنی ذریعے سے ثابت ہے۔ اللہ کے دین میں یہ تقسیم غلط ہے۔

اور قطعیت کے لیے اجماع کا ہونا ضروری نہیں ہے کہ قرآن مجید اس وقت بھی قطعی تھا جبکہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں اس کے بارے اختلافات ہوئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب دنیا سے رخصت ہوئے تو قرآن پر اجماع نہیں تھا۔ اگر اس وقت قرآن مجید پر اجماع ہوتا تو جمع وتدوین قرآن کی ساری کہانی اور اس کی وجوہات واسباب سب جھوٹ تسلیم کرنا ہو گا۔ اجماع مصحف عثمانی پر ہوا ہے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں۔ اس سے پہلے قرآن مجید پر بہت اختلاف تھا جیسا کہ صحیح روایات میں موجود ہے۔ اس کے بیان کے لیے ابن ابی داؤد رحمہ اللہ کی کتاب المصاحف کافی ہے۔[1] لیکن اس اختلاف کا یہ مطلب نہیں تھا کہ قرآن مجید قطعی نہیں تھا۔

اسی طرح جب ہم یہ کہتے ہیں کہ قرآن مجید کے علاوہ حدیث بھی دین ہے۔ جب یہ مان لیا تو اب پروردگار مجھے آدھا دین قطعی ذریعے سے دے اور آدھا ظنی ذریعے سے، یہ رانگ نمبر ہے۔ قرآن مجید اور حدیث نبوی ہر دور میں قطعی سند سے ثابت ہوتے رہیں ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ یہی تاریخی حقیقت بھی ہے اور فرد پر اتمام حجت کے لیے پروردگار کی دلیل بھی۔

خبر واحد سے ثابت شدہ عقیدہ قطعی ہے یا ظنی؟

مکتب فراہی اور فکر غامدی سے متاثر لوگوں کا کہنا یہ ہے کہ خبر واحد سے کوئی عقیدہ ثابت نہیں ہوتا حالانکہ ایسی بات سلف صالحین میں سے کسی نے بھی نہیں کی ہے۔ روایتی مکاتب فکر میں خبر واحد جس طرح فقہی اعمال کا مصدر رہے، اسی طرح دینی عقائد کا بھی ماخذ ہے البتہ ان میں اس بارے اختلاف ہے کہ خبر واحد سے جو عقائد ثابت ہوتے ہیں، وہ قطعی ہیں یا ظنی ہیں۔ ہماری رائے میں خبر واحد سے ثابت شدہ عقائد قطعی ہیں کہ وہ عقیدہ

[1] ابن أبي داود، أبو بكر عبد الله بن سليمان بن الأشعث الأزدي السجستاني (المتوفى: 316هـ)، كتاب المصاحف، الفاروق الحديثة، القاهرة، الطبعة الأولى، 1423هـ - 2002م

ہی کیا ہے کہ جو ظن پر قائم ہو۔ عقیدہ اور اس کا ظنی ہونا، یہ دو متضاد باتیں ہیں۔ اگر وہ ظنی ہے تو وہ عقیدہ نہیں ہے اور اگر عقیدہ ہے تو ظنی نہیں ہو سکتا۔ چاہے آپ بغیر سوچے سمجھے زبان سے اس کو ظنی کہہ رہے ہوں لیکن آپ کا عمل اس کی قطعیت کی گواہی دے رہا ہو گا۔

وہ عقیدہ ہی کیا کہ جسے شک لاحق ہو۔ اور ظن تو کہتے ہی اس کو ہیں کہ جس میں شک کا پہلو مغلوب ہو۔ البتہ شک اور شبہے میں فرق ہے کہ شبہ عارضی ہوتا ہے لہذا ایک حال ہے نہ کہ صفت جبکہ شک تو ایسا خلجان ہے کہ جس میں سلب و ایجاب میں سے کوئی بھی پہلو غالب نہ ہو سکے۔ مومن کو شبہ لاحق ہو سکتا ہے لیکن وہ شک میں مبتلا نہیں رہ سکتا۔ امام مالک، امام شافعی، امام احمد، امام ابن حزم اور حنفیہ کی ایک جماعت رحمہم اللہ کے نزدیک خبر واحد سے علم یقین حاصل ہوتا ہے نہ کہ محض ظن۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے جب سوال کیا گیا کہ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ خبر واحد سے عمل تو واجب ہو جاتا ہے لیکن اس سے یقینی علم حاصل نہیں ہوتا تو انہوں نے جواب میں کہا کہ مجھے نہیں معلوم کہ یہ کہاں سے یہ بات لے آئے ہیں! [1]

خبر واحد سے کون سے اسلامی عقائد ثابت ہوتے ہیں؟ ذرا اس پر ہم کچھ روشنی ڈال دیتے ہیں۔ پھر جو ان عقائد کو ظنی سمجھتے ہیں، وہ ذرا اس پر غور کر لیں کہ ان کا یہ عقیدہ ہے بھی یا نہیں!

① اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء سے افضل ہیں۔
② میدان محشر میں اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم شفاعت کریں گے۔
③ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات جو احادیث میں نقل ہوئے ہیں۔
④ انسان اور کائنات کی ابتداء، جنات اور فرشتوں کی صفات، جنت اور جہنم کی صفات۔

---

[1] ابن قيم الجوزية، محمد بن أبي بكر بن أيوب بن سعد شمس الدين (المتوفى: 751ھ)، مختصر۔ الصواعق المرسلة على الجهمية والمعطلة، دار الحديث، القاهرة، الطبعة الأولى، 1422ھ - 2001م، ص 553

۵ عشرہ مبشرہ جنتی ہیں۔

۶ قیامت والے دن جو میزان لگایا جائے گا، اس کے دو پلڑے ہوں گے۔

۷ حوض کوثر پر ایمان، اور اس پر ایمان کہ جو حوض کوثر سے پانی پیے گا، کبھی بھی پیاسا نہ ہو گا۔

۸ قلم پر ایمان اور اس پر کہ قلم نے ہر شیء کو لکھ دیا ہے۔

۹ اس پر ایمان کہ اللہ تعالی نے انبیاء کا جسم زمین پر حرام کر دیا ہے۔

۱۰ امام مہدی کے خروج، دجال کی آمد، اور عیسی علیہ السلام کے نزول پر ایمان۔

۱۱ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے آسمانوں پر جانے اور اللہ کی ان نشانیوں پر ایمان جن کے دیکھنے کا ذکر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی احادیث میں کیا۔ وغیرہ

حدیث کی درایتی تحقیق

حدیث کی درایتی تحقیق کی معاصر تحریک کو اس بارے دو بنیادی غلط فہمیاں لاحق ہوئیں۔ ایک یہ کہ ان کا خیال ہے کہ محدثین نے احادیث کی روایتی تحقیق کی ہے جبکہ درایتی نہیں لہذا ہمیں حدیث کی درایتی تحقیق کی ضرورت ہے۔ اور دوسری یہ ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے چند واقعات میں قلت تدبر کے نتیجے میں وہ یہ سمجھ بیٹھے کہ صحابہ بھی درایت بمعنی عقل کی بنیاد پر احادیث کو رد کر دیتے تھے۔

پہلی غلط فہمی تو صحیح حدیث کی شرائط پر غور نہ کرنے کا نتیجہ ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ محدثین نے احادیث کی روایت اور درایت دونوں اعتبارات سے جانچ پڑتال کی ہے۔ صحیح حدیث کی پہلی تین شرائط کا تعلق روایت اور آخری دو کا درایت سے ہے کہ شذوذ اور علت کی بحث متن میں زیادہ ہوتی ہے۔ اور علت کی بیسیوں قسمیں ایسی ہیں کہ جن کا تعلق متن سے ہوتا ہے اور اس کا اندازہ "کتب العلل" کے مطالعہ سے ہو جاتا ہے۔

پس محدثین نے احادیث کی اسناد اور متن دونوں کی تحقیق کے اصول وضع کیے اور ان دونوں پر اخبار آحاد کی جانچ پڑتال کی ہے۔ البتہ یہ واضح رہے کہ درایت یعنی متن کی تحقیق کا معنی ومفہوم محدثین کے ہاں کچھ اور ہے اور مکتب فراہی اور ان کے متاثرین کے

ہاں کچھ اور ہے۔

ہمارے استاذ ڈاکٹر حافظ حمزہ مدنی صاحب نے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالہ بعنوان "علم حدیث میں اسناد و متن کی تحقیق کے اصول" میں استدراکات صحابہ پر بہت عمدہ عقلی و منطقی گفتگو فرمائی ہے اور معاصر محققین میں سے مولانا فراہی رحمہ اللہ، مولانا اصلاحی رحمہ اللہ، غامدی صاحب، پروفیسر تقی امینی صاحب اور جناب عمار خان ناصر صاحب کے حدیث کی درایتی تحقیق کے بارے نظریات کا خوب تعاقب فرمایا ہے۔ ششماہی "رشد" کے حالیہ دو شماروں جنوری اور جولائی 2015ء میں حدیث کی درایتی تحقیق کے بارے صحیح فکر پر مشتمل قابل قدر مضامین شائع کیے گئے ہیں۔

دوسری غلط فہمی کی بنیاد دوہرا معیار ہے۔ یعنی جب پہلے سے ذہن میں یہ طے ہو کہ ہم نے ان احادیث کو قبول نہیں کرنا تو انسانی ذہن قابل توجیہ واقعات میں بھی اعتراضات تلاش کر لیتا ہے۔ یہی کام مستشرقین میں سے نولڈکے، رچرڈ بیل اور آرتھر جیفری نے قرآن مجید کے ساتھ کیا ہے۔ اور انہوں نے قرآن مجید کے متن کی تحقیق اس کے متن سے کی ہے کہ جسے وہ "انتقاد اعلی کے اصول" (Principle of Higher Criticism) کا نام دیتے ہیں۔ مستشرقین کی ایک جماعت قرآن مجید کی درایتی تحقیق سے یہ نتیجہ نکالتی ہے کہ یہ خدا کا کلام نہیں ہو سکتا ہے۔[1] اور ہم مستشرقین کے

---

[1] Harald Motzk, "Alternative accounts of the Quran's formation", in The Cambridge Companion to the Quran, ed. Jane Dammen McAuliffe, UK: Cambridge University Press, 2006,pp. 59-71

Higher Critical scholarship of the Koran, using methodologies adapted from biblical criticism, is still largely confined to scholars working in Western universities. So, sensitive is this area for Muslims that `Ibn Warraq´, a Muslim-born writer trained in Arabic who accepts the findings of radical Western scholarship, has felt it necessary to publish his work under a pseudonym. [Malise Ruthven, Fundamentalism: A Very Short Introduction, London: Oxford University Press, 2007, p. 49]

As Richard Bell and Montgomery Watt argue in their scholarly Introduction to the Quran: The assumption that God is himself the speaker in every passage leads to difficulties. [Ibid., p. 50]

اعتراضات کے بھی جوابات اپنی ایک مستقل تصنیف میں دے چکے ہیں۔

ہمیں یہ نہیں کہنا کہ حدیث کی درایتی تحقیق کا مطالبہ کرنے والے مستشرقین سے متاثر ہیں بلکہ یہ کہنا ہے کہ جب انسانی ذہن پہلے سے ایک متن (text) کے مقام اور مرتبے کا تعین کر چکا ہوتا ہے تو اس کا تجزیہ کرتے ہوئے اس کا سوچنے کا انداز بالکل ایک جیسا ہوتا ہے۔ قرآن مجید کی درایتی تحقیق کے دعوی کے نتیجے میں قرآن مجید کا انکار اور حدیث کی درایتی تحقیق کے دعوی کے نتیجے میں احادیث کا انکار کرنے والوں کا سوچنے کا انداز بالکل ایک جیسا ہے یعنی ان کے ذہنی پیٹرن ملتے ہیں۔ اور طرفہ تماشا یہ ہے کہ دونوں کی تحقیق ان کے خیال میں غیر جانبدارانہ ہے۔ حدیث کے معاصر درایتی محققین کا بس یہ ایمان ہے کہ انہوں نے قرآن مجید کی درایتی تحقیق نہیں کرنی ہے ورنہ وہ بھی مستشرقین کے نتائج کے حامل ہوں گے لہذا یہ درایتی محققین جب قرآن مجید کے معاملے میں ویسے ہی جانبدار ہیں جیسا کہ روایت پسند حدیث کے معاملے میں، تو یہ روایت پسندوں کو حدیث کے معاملے میں جانبداری کا طعنہ کیسے دے سکتے ہیں؟

ایک ملحد سے احادیث کے معانی پر مکالمہ

ملحد (atheist) کس طرح احادیث کو اپنے معانی پہناتے ہیں تو اس بارے ایک مکالمہ راقم اور ایک ملحد غلام رسول کے درمیان ہوا۔ راقم نے اس مکالمے کی امیج فائل اپنی فیس بک وال پر شیئر کی ہے۔ غلام رسول، ظاہری بات ہے کہ فیس بک پر اس ملحد کا

The Egyptian academic Nasr Abu Zaid, who ventured to use modern literary critical methodology in his approach to the Koran, was forced into exile. Higher criticism of the Koran, where the text is deconstructed in accordance with methods developed by biblical scholars since the 18th century, is still very largely confined to scholars who are not Muslims. Examples include the work of John Wansbrough, Patricia Crone, and Gerald Hawting, Western scholars of Islam who do not accept the traditional view of its origins as related in the earliest texts. [Ibid., pp. 40-41]

فرضی نام ہے جبکہ وہ ایک ملحدانہ فیس بک پیج کا ایڈ من ہے اور فیس بک کی دنیا میں کافی معروف شخصیت ہے۔ غلام رسول صاحب نے اپنے پیج پر ایک حدیث شیئر کی کہ جس میں حدیث کا ترجمہ ایسا لگایا جو کہ بنتا نہیں تھا اور اپنے اسی ترجمے سے وہ صاحب اس حدیث میں عریانی اور فحاشی ثابت کر رہے تھے۔

اس مکالمے کا حاصل یہ ہے کہ ملحدین اور منکرین کس طرح حدیثوں کا معنی تبدیل کرتے ہیں اور اپنے ذہن کا گند احادیث سے ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جب ان سے پوچھا جائے کہ انہوں نے اس حدیث کا یہ معنی کیسے کیا ہے؟ گرامر اور زبان کے کن اصول وضوابط کی روشنی میں کیا ہے؟ تو امر واقعہ یہ ہے کہ ان کے پاس اس کا کوئی علمی جواب نہیں ہوتا کہ انہوں نے یہ معنی کیوں کیا ہے؟

پس اگر آپ احادیث کا صحیح ترجمہ کر دیں تو محض صحیح ترجمہ بیان کر دینے سے ملحد اور منکر حدیث کا وہ اعتراض رفع ہو جاتا ہے کہ جسے وہ اپنے تئیں کوئی علمی اعتراض سمجھ رہا ہوتا ہے۔ اس کیس میں بھی حدیث پر اعتراض کی صرف ایک ہی بنیاد تھی اور وہ اس ملحد کا کیا ہوا ترجمہ تھا۔ جیسے ہی اس کے ترجمے پر سوالیہ نشان کھڑا ہوا اور وہ اپنے ترجمے سے رجوع کرنے لگا تو حدیث پر سے اعتراض بھی رفع ہو گیا۔ ملحد کا ترجمہ یہ تھا:

”عروہ بن الزبیر سے روایت ہے۔ حضرت عائشہ نے کہا۔ مجھے معلوم نہ ہوا کہ اچانک زینب بنت جحش میرے گھر بغیر اجازت کے آ گئیں وہ غصہ میں تھیں انہوں نے کہا یا رسول ﷺ میں سمجھتی ہوں جب ابو بکر کی چھوکری اپنے قمیض الٹے تو وہ آپ ﷺ کو کافی ہے۔“ [سنن ابن ماجہ، حدیث 1982][1]

جبکہ اس حدیث کا عربی متن یہ ہے:

«عَنْ عُرْوَةَ بْنِ الزُّبَيْرِ، قَالَ: قَالَتْ عَائِشَةُ: مَا عَلِمْتُ حَتَّى دَخَلَتْ عَلَيَّ زَيْنَبُ بِغَيْرِ إِذْنٍ وَهِيَ غَضْبَى، ثُمَّ قَالَتْ: يَا رَسُولَ اللَّهِ، أَحَسْبُكَ

[1]Retrieved 2 February, 2016 from Pakistani Free Thinkers Facebook Page. For detail please visit my Timeline "Hm Zubair" post on 2 February, 2016.

إِذَا قَلَبَتْ بُنَيَّةُ أَبِي بَكْرٍ ذُرَيْعَتَيْهَا»[1]

ملحد نے اس روایت میں موجود «بُنَيَّةُ» کے لفظ کا ترجمہ چھوکری اور «ذُرَيْعَتَيْهَا» کا ترجمہ قمیص کیا ہوا ہے؟ جب میں نے ملحد کو اس بات پر پکڑا کہ چھوکری کسی عربی لفظ کا ترجمہ کیا ہے تو وہ آئیں بائیں شائیں کرنے لگا اور کہنے لگا کہ میں نے تو فلاں مترجم سے ترجمہ لیا ہے۔ میں نے کہا کہ جو ترجمہ آپ نے کیا ہے، وہ کسی ایک مترجم سے دکھا دو۔ اب اسے وہ بھی نہ ملے۔ دراصل اس نے کیا یہ تھا کہ مختلف ترجموں کو ملا کر ایک ترجمہ بنالیا تھا۔ یعنی جس ترجمے میں اس کے ذہنی گند کے مناسب کوئی لفظ اسے مل گیا، اس نے وہ اٹھالیا اور ایک ترجمہ بنالیا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ احادیث کی کتابوں کے مترجمین کو الفاظ کے انتخاب میں احتیاط کرنی چاہیے کہ اسلام مخالفین عناصر ان کے تراجم کو منفی مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اور ہماری رائے میں کتبِ احادیث کے بہت سے تراجم کو نظر ثانی کی ضرورت ہے کہ اس کی کافی ساری مثالیں ہیں کہ حدیث کا مناسب ترجمہ نہ ہونے کی وجہ سے ملحدین اور منکرین کو اعتراض کا موقع مل گیا جیسا کہ کچھ مثالیں ہم آگے چل کر بیان بھی کریں گے۔

منکرین حدیث کی شطحیات

منکرین حدیث، حدیث کے انکار میں کس حد تک اخلاقی اور علمی طور گر سکتے ہیں کہ اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ انعام رانا صاحب[2] نے اپنی فیس بک وال پر ڈاکٹر شبیر احمد کے حوالے سے کچھ ایسی احادیث نقل کی ہیں کہ جو ان کی نظر میں واہیات احادیث ہیں۔ ان میں سے ایک روایت یہ بھی ہے جو انہوں نے بیان کی ہے:

"ایک شخص نے حضور (ص) سے تنہا ہونے کی شکایت کی۔ کہا کبوتری کو زوجہ بنالو۔" [ابن القیم، المنار الحنیف، ص 106][3]

---

[1] سنن ابن ماجة: 637/1

[2] پیشے کے اعتبار سے وکیل ہیں، لندن میں مقیم ہیں اور مکالمہ کے نام سے ایک ویب سائیٹ کے ایڈیٹر ہیں۔

[3]Retrieved 2 February, 2016 from Inam Rana Sb Facebook Page. For detail

اب یہ صاحب اپنی وال پر یہ نقل کر کے عام لوگوں کو یہ کہہ رہے ہیں کہ احادیث پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ ایسی باتوں کو اللہ کے رسول ﷺ کے اقوال مان لو۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ان صاحب کو اس کتاب کا صحیح نام بھی لکھنا نہیں آتا کہ جہاں سے وہ حدیث نقل کر رہے ہیں۔ چلیں! مان لیا کہ ٹائپنگ کی غلطی ہے لیکن اگر کتاب کا مکمل نام نقل کر دیتے تو وہ فحش غلطی نہ کرتے جو کہ یہ کر چکے ہیں۔ اس کتاب کا مکمل نام "المنار المنيف في الصحيح والضعيف" ہے کہ جس میں امام ابن قیم رحمہ اللہ نے ضعیف احادیث کو صحیح سے علیحدہ کیا ہے۔

اب امام ابن القیم رحمہ اللہ نے یہ روایت نقل کرنے سے پہلے لکھا ہے کہ کبوتروں کے بارے تمام روایات ضعیف اور موضوع ہیں اور اس کے بعد انہوں نے ان ضعیف اور موضوع روایات کا ذکر کیا ہے جو کبوتروں کے بارے نقل ہوئی ہیں۔ اور جناب ڈاکٹر شبیر احمد صاحب نے امام ابن القیم رحمہ اللہ کی کتاب سے یہ روایت بغیر سمجھے اٹھالی ہے اور اب ان کے مقلدین بھی بغیر سمجھے اسے نقل کیے جا رہے ہیں۔ اور طرفہ تماشا یہ ہے کہ جواب دوناں! جواب دوناں! کی رٹ لگا رکھی ہے۔

امام ابن قیم رحمہ اللہ کی اصل عبارت ملاحظہ ہو:

فَصْلٌفِي ذِكْرِ جَوَامِعٍ وَضَوَابِطٍ كُلِّيَّةٍ فِي هَذَا الْبَابِ: فَمِنْهَا أَحَادِيثُ الْحَمَامِ -بِالتَّخْفِيفِ- لا يَصِحُّ مِنْهَا شَيْءٌ. وَمِنْهَا حَدِيثِ "كَانَ يُعْجِبُهُ النظر إلى الحمام". وَحَدِيثِ "كَانَ يُحِبُّ النَّظَرَ إِلَى الْخُضْرَةِ وَالأُتْرُجِّ والحمام الأحمر". وَحَدِيثِ "شَكَا رَجُلٌ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْوَحْدَةَ فَقَالَ لَهُ: لَوِ اتَّخَذْتَ زَوْجًا مِنَ حَمَامٍ فَآنَسَكَ وَأَصَبْتَ مِنْ فراخه".[1]

علامہ ابن جوزی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو اپنی کتاب "الموضوعات" میں نقل کیا

---

please visit my Timeline "Hm Zubair" post on 2 February, 2016.

[1] ابن قيم الجوزية، محمد بن أبي بكر بن أيوب بن سعد شمس الدين (المتوفى: 751هـ)، المنار المنيف في الصحيح والضعيف، مكتبة المطبوعات الإسلامية، حلب، الطبعة الأولى، 1390هـ/1970م، ص 106

ہے۔اور اگر اس کتاب کا اردو ترجمہ ہو جائے تو یقین مانیے کہ حدیث پر اعتراض کرنے والوں کا بنیادی مصدر قرار پائے کہ کتاب کے نام اور موضوع پر غور کیے بغیر تھوک کے حساب سے حدیثوں پر اعتراضات کا ریکارڈ قائم کر دیں۔اب معلوم نہیں، ان منکرین کو ہماری یہ بات سمجھ بھی آئی ہے یا نہیں۔یہ منکرین جن احادیث پر اعتراضات قائم کرتے ہیں، ان کی بڑی تعداد ضعیف اور موضوع روایات پر مشتمل ہے کہ جنہیں پہلے ہی سے امت نے رد کر رکھا ہے۔

احادیث کے بارے قاری حنیف ڈار صاحب کے مغالطے

قاری حنیف ڈار صاحب نے آج کل اپنی وال سے احادیث کے بارے شکوک وشبہات کی تحریک چلا رکھی ہے کہ جس پر بعض دوستوں نے تبصرہ کرنے کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔ عرض یہ ہے کہ محض اعتراض وارد کر دینے سے اگر کوئی کلام مشکوک ٹھہرتا تو سب سے پہلے اللہ کی کتاب مشکوک قرار پاتی کہ خود قرآن مجید کے بیان کے مطابق مشرکین مکہ کے اعتراضات میں سے یہ بھی تھا کہ جہنم میں زقوم کا درخت کیسے ممکن ہے؟ جہنم آگ کا دوسرا نام ہے اور اس میں درخت کا باقی رہنا ممکن نہیں ہے۔ پس محض اعتراض سے کوئی کلام مشکوک نہیں ہو جاتا بلکہ اعتراض کی نوعیت، معیار اور قوت دیکھی جاتی ہے۔

پس منکرین حدیث کا یہ قضیہ بہت ہی سطحی ہے کہ بخاری ومسلم انسانوں نے مرتب کی ہیں، اور انسانی کام میں غلطی کا امکان ہے، پس بخاری ومسلم غلط ہیں۔ اگر بخاری ومسلم انسانوں نے مرتب کی ہے تو قرآن مجید کس نے مرتب کیا ہے؟ کیا جو قرآن مجید ہمارے پاس اس وقت موجود ہے، وہ ہمیں براہ راست حضرت جبرئیل علیہ السلام سے موصول ہوا ہے؟ کیا اس قرآن مجید کو فرشتوں نے لکھ کر ایک کتاب کی صورت دی ہے؟ کیا اس قرآن مجید کو آسمانوں سے ایسے ہی نازل کیا گیا تھا کہ جس صورت میں اب یہ ہمارے پاس ہے یعنی وزارت اوقاف کے رجسٹرڈ قاریوں کی مہرِ تصدیق کے ساتھ؟

بلاشبہ انسانوں نے ہی اس قرآن مجید کو یاد کیا، انسانوں نے ہی اس قرآن مجید کو نقل کیا، انسانوں نے ہی اس کو لکھا ہے، انسانوں نے ہی اس کے حرکات اور اعراب لگائے، انسانوں نے اس کے نقطے، رموز اور اوقاف ایجاد کیے، انسانوں نے اس کو رکوعوں اور پاروں میں تقسیم کیا، انسانوں نے ہی اس کو کتابی صورت دی، تو کیا انسانی کام میں غلطی نہیں ہو سکتی؟

یہاں سے ملحد اور مومن میں فرق ہو جاتا ہے۔ ملحد اور مستشرق یہ ثابت کرتا ہے کہ قرآن مجید کی تالیف وتدوین ایک انسانی کام ہے لہذا اس میں غلطیاں ہوئی ہیں۔ اور ملحدین کی دو صد تحریریں، جو ہمارے علم میں ہیں، اس مقدمے کو ثابت کرنے کے لیے موجود ہیں۔ لیکن مومن کا ایمان یہ ہے کہ یہ سب کچھ انسانوں نے ہی کیا ہے لیکن خدا نے ان سے کروایا ہے لہذا غلطی کا امکان نہیں ہے۔ اور حدیث کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے کہ خدا نے اس کی تدوین انسانوں سے کروائی گئی ہے جبکہ اس کی حفاظت اللہ عزوجل نے اسی طرح فرمائی ہے جیسے قرآن مجید کی فرمائی ہے۔

اگر منکر حدیث کو حدیث پر یہ اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ سورج اللہ کے عرش کے نیچے جا کر کیسے سجدہ کر سکتا ہے؟ تو ملحد کو قرآن مجید سے یہ شکایت ہے کہ قرآن کا سورج ایک گدلے پانی کے چشمے میں غروب ہوتا ہے؟ اگر منکر حدیث کو یہ اعتراض ہے کہ حضرت موسی علیہ السلام اپنی قوم کے سامنے بے لباس ہو گئے تھے تو ملحد کو قرآن سے یہ شکایت ہے کہ آدم اور حوا علیہما السلام اپنے دشمن کے سامنے بے لباس ہو گئے؟ اگر منکر حدیث کو یہ اعتراض ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم چھوٹی عمر کی لڑکی سے کیسے نکاح کر سکتے ہیں؟ تو ملحد کو یہ شکایت ہے کہ خدا چھوٹے بچے کے قتل کا حکم خضر علیہ السلام کو کیسے دے سکتا ہے؟ اگر منکر حدیث کو یہ اعتراض ہے کہ مرتد کی سزا قتل کیسے ہو سکتی ہے؟ تو ملحد کو قرآن مجید سے یہ شکایت ہے کہ بچھڑے کی پوجا کرنے پر توبہ کی یہ صورت کہ آپس میں ہی ایک دوسرے کی گردنیں اڑائیں، کیسے خدا کی طرف سے ہو سکتی ہے؟ وعلی ہذا القیاس، حدیث پر کوئی اعتراض ایسا نہیں ہے جو قرآن مجید پر بھی وارد نہ ہوتا ہو۔

ہمارے علم کی حد تک غلام احمد پرویز صاحب، جناب قاری حنیف ڈار صاحب سے زیادہ ذہین، زیادہ محنتی اور زیادہ علم رکھنے والے تھے۔ یقین نہ آئے تو ان کی کتابیں اٹھا کر دیکھ لیں۔ لیکن آج کتنے لوگ ان کے پیروکار ہیں؟ ہاں! لوگ پرویز صاحب کو جانتے ہوں گے، بہت لوگ جانتے ہوں گے، لیکن کن الفاظ میں؟ اور احادیث پر ایمان لانے والے آج بھی لاکھوں نہیں کروڑوں میں ہیں جیسا کہ ماضی میں ہر دور میں رہے ہیں اور علی وجہ البصیرۃ رہے ہیں۔

دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ منکرین حدیث میں سے کتنے ہیں کہ جنہوں نے قرآن مجید کا دفاع کیا ہو؟ امر واقعہ یہ ہے کہ ملحدین اور مستشرقین نے قرآن مجید پر جو کیچڑ اچھالا ہے، اس کا بھی علمی و تحقیقی جواب سینکڑوں کتب و مقالات کی صورت میں اگر کسی نے دیا ہے تو یہ وہی لوگ ہیں جو حدیثوں پر ایمان رکھنے والے ہیں۔ باقی یہ بات درست ہے کہ لوگوں کی ایک جماعت تماش بین ہوتی ہے کہ جہاں مداری کا تماشا دیکھیں گے، جمع ہو جائیں گے اور لائک مار چھوڑیں گے۔ لیکن یہ ہجوم ہمیشہ عارضی ہوتا ہے اور ثبات ہمیشہ حق کے لیے ہی ہوتا ہے۔

امام ابن شہاب زہری رحمہ اللہ ائمہ محدثین، مفسرین اور فقہاء کی نظر میں

قاری حنیف ڈار صاحب نے اپنے پیش رو مفکرین کے اس اعتراض کو شد و مد کے ساتھ دہرایا ہے کہ تابعین کے دور میں احادیث کو سب سے زیادہ نقل کرنے والے امام ،ابن شہاب زہری رحمہ اللہ ناقابل اعتبار شخصیت ہیں لہذا حدیث کا اکثر ذخیرہ ناقابل اعتماد ہے۔[1] ہم ذیل میں امام ابن شہاب زہری رحمہ اللہ (متوفی ۱۲۵ھ) کے بارے میں ائمۂ جرح وتعدیل، ائمہ محدثین اور ائمۂ فقہاء اور ان کے معاصر علماء کی آراء نقل کر رہے ہیں کہ جس سے منکرین حدیث کے اس اعتراض کی حقیقت واضح ہو جائے گی۔

---

[1] ڈاکٹر غلام جیلانی برق صاحب کا تو انکار حدیث سے رجوع صریح ہے لیکن علامہ تمنا عمادی کے بارے بھی بعض محققین کا کہنا ہے کہ انہوں نے بھی اپنے انکار حدیث کے موقف سے رجوع کر لیا تھا۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: محمد تنزیل الصدیقی الحسینی، کیا علامہ تمنا عمادی منکر حدیث تھے؟، مجلہ الواقعہ، کراچی، شمارہ 1، اپریل 2012ء

حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ فرماتے ہیں: عليكم بابن شهاب هذا فإنكم لا تلقون أحدا أعلم بالسنة الماضية منه۔ تم ابن شہاب کو لازمی پکڑو (ان سے استفادہ کرو) کیونکہ گزری ہوئی سنن کے بارے میں ان سے بڑھ کر کوئی جاننے والا نہیں ہے۔

معروف تابعی قتادہ رحمہ اللہ (متوفی ۱۰۹ھ) فرماتے ہیں: ما بقي أحد أعلم بسنة ماضية من ابن شهاب۔ گزشتہ سنن کے بارے میں ابن شہاب سے زیادہ علم رکھنے والا کوئی بھی باقی نہیں رہا۔

تابعی مکحول رحمہ اللہ (متوفی ۱۰۹ھ) فرماتے ہیں: ما بقي على ظهرها أحد أعلم بسنة ماضية من الزهري۔ زمین کی پشت پر گزری ہوئی سنت کے بارے میں زہری رحمہ اللہ سے بڑھ کر کوئی عالم باقی نہیں رہا ہے۔

ابو ایوب سختیانی رحمہ اللہ (متوفی ۱۳۱ھ) فرماتے ہیں: ما رأيت أعلم منه۔ میں نے ان سے بڑا عالم کوئی نہیں دیکھا۔

امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں: بقي ابن شهاب وماله في الناس نظير۔ ابن شہاب رحمہ اللہ باقی رہ گئے اور ان کی کوئی مثال اس دنیا میں نہیں ہے۔

امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: الزهري أحسن الناس حديثا وأجود الناس إسنادا۔ زہری رحمہ اللہ لوگوں میں حدیث کے اعتبار سے سب سے بہتر اور سند کے اعتبار سے سب سے عمدہ ہیں۔

امام لیث بن سعد (متوفی ۱۷۵ھ) رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میں نے ابن شہاب زہری سے زیادہ جامع العلوم کسی عالم کو نہیں دیکھا۔

ابو بکر الھذلی رحمہ اللہ (متوفی ۱٦۷ھ) فرماتے ہیں: قد جالست الحسن وابن سيرين فما رأيت أحدا أعلم منة يعني الزهري۔ میں حسن بصری اور ابن سیرین رحمہما اللہ کے ساتھ بیٹھا، لیکن میں نے زہری رحمہ اللہ سے بڑھ کر کوئی عالم نہیں دیکھا۔

محمد بن سعد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: وكان الزهري ثقة كثير الحديث والعلم

والروایة فقیها جامعا۔ محدثین کا کہنا ہے کہ زہری ثقہ راوی ہے اور کثرت سے علم رکھنے والا، احادیث کو جاننے والا اور احادیث کو نقل کرنے والا ہے۔

سعید بن عبد العزیز رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ما کان الا بحرا۔ وہ تو علم کا ایک سمندر ہے۔

سفیان ثوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: کان الزهری أعلم أهل المدینة۔ امام زہری رحمہ اللہ اہل مدینہ میں سب سے بڑے عالم ہیں۔

عمرو بن دینار رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ما رأیت أنص للحدیث من الزهری۔ میں نے حدیث کی سند بیان کرنے میں زہری رحمہ اللہ سے بڑھ کر کسی کو نہیں دیکھا۔

امام یحییٰ بن معین رحمہ اللہ فرماتے ہیں :قال الدارمی قلت له (یعنی یحیی بن معین) الزهری أحب إلیك في سعید بن المسیب أو قتادة فقال کلاهما فقلت فهما أحب الیك أو یحیٰی بن سعید فقال کل ثقة۔ امام دارمی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں نے یحییٰ بن معین رحمہ اللہ سے کہا کہ زہری آپ کو سعید بن مسیب سے زیادہ محبوب ہے یا قتادہ؟ تو انہوں نے کہا دونوں۔ تو میں نے پھر کہا کہ وہ دونوں آپ کو زیادہ محبوب ہیں یا یحییٰ بن سعید؟ تو یحییٰ بن معین نے کہا: یہ سب ثقہ راوی ہیں۔

امام علی بن مدینی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: حفظ العلم علی أمة محمد ستة فلأهل مكة عمرو بن دینار ولأهل المدینة بن شهاب الزهری۔ حدیث کا علم اُمت محمد میں چھ افراد نے محفوظ کیا: اہل مکہ میں سے عمرو بن دینار نے اور اہل مدینہ میں ابن شہاب الزہری نے۔

امام یحییٰ بن سعید رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ما بقی عند أحد من العلم ما بقی عند ابن شهاب۔ کسی ایک کے پاس بھی وہ علم نہیں رہا جو ابن شہاب کے پاس ہے۔

امام ابو حاتم الرازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: أثبت أصحاب أنس الزهری۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کے ساتھ بیٹھنے والوں میں سب سے زیادہ ثابت زہری رحمہ اللہ ہیں۔

امام نسائی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: أحسن أسانید تروی عن رسول الله أربعة منها:

الزهری عن علی بن الحسین عن الحسین بن علی عن علی ابن أبی طالب عن رسول الله Uوالزهری عن عبیدالله بن عبدالله بن عتبة بن مسعود عن ابن عباس عن عمر عن رسول الله۔ سب سے بہتر اسناد جو کہ اللہ کے رسول ﷺ سے مروی ہیں وہ چار ہیں: زہری، علی بن حسین سے، وہ حسین بن علی سے، وہ علی بن ابی طالب سے اور وہ اللہ کے رسول ﷺ سے روایت کرتے ہیں۔ اور زہری، عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبہ بن مسعود سے، وہ عبد اللہ بن عباس سے، وہ عمر بن خطاب سے اور وہ اللہ کے رسول ﷺ سے روایت کرتے ہیں۔

امام ابن حبان رحمہ اللہ لکھتے ہیں:رأی عشرة من أصحاب رسول اللهوکان أحفظ أهل زمانه وأحسنهم سیاقا لمتون الأخبار وکان فقیها فاضلا۔ ابن شہاب الزہری رحمہ اللہ نے دس صحابہ کی زیارت کی ہے اور اپنے زمانے کے سب سے بڑے حدیث کے حافظ تھے اور احادیث کے متون کو بیان کرنے میں سب سے اچھے تھے اور فقیہ اور فاضل تھے۔

امام احمد العجلی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:تابعی ثقة۔ تابعی اور ثقہ تھے۔

امام ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:الفقیه الحافظ متفق علی جلالته وإتقانه۔ ابن شہاب زہری رحمہ اللہ فقیہ اور الحافظ ہیں، علم حدیث میں ان کی بزرگی اور حافظے کی پختگی پر محدثین کا اتفاق ہے۔

امام ذہبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:محمد بن مسلم الزهری الحافظ الحجة۔ محمد بن مسلم الزہری رحمہ اللہ 'الحافظ' اور 'الحجۃ' ہیں۔ ان تمام اقوال کے حوالہ جات اور اس بارے تفصیل ہماری کتاب "فکر غامدی" میں موجود ہے۔[1]

امر واقعہ یہ ہے کہ امام المحدثین، امام ابن شہاب زہری رحمہ اللہ کی تعدیل و توصیف سے اسماء الرجال کی کتب بھری پڑی ہیں۔ اب امام ابن شہاب الزہری رحمہ اللہ کے معاصر

---

[1] محمد زبیر، حافظ، فکر غامدی: ایک تحقیقی وتجزیاتی مطالعہ، مکتبہ رحمۃ للعالمین، لاہور، 2012ء، ص 88-95

فقہاء، محدثین اور ائمہ دین کی شہادت ان کے حق میں ہم رد کر دیں کہ وہ حدیث کے امام تھے اور آج کے ان جدید محققین یا متجددین کی گواہی قبول کر لیں کہ جو تیرہ صدیوں بعد انہیں حدیث میں ناقابل اعتماد کہہ رہے ہیں۔

کتب احادیث میں شیعہ راویوں سے روایت

احادیث کی اکثر کتابوں میں شیعہ راویوں سے بھی روایت لی گئی ہے اور منکرین حدیث کا حدیث پر ایک بڑا اعتراض یہ بھی ہے کہ شیعہ راویوں سے روایت کیوں؟ قاری حنیف ڈار صاحب نے بھی اس اعتراض کو مرچ مسالہ لگا کر دہرایا ہے۔ اس اعتراض کی حقیقت یہ ہے کہ مثال کے طور صحیح بخاری کی تدوین تیسری صدی ہجری کے نصف اول میں ہوئی ہے۔ اب ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تیسری صدی ہجری کے نصف اول میں جو تشیع تھا، کیا وہ یہی تھا جو آج چودھویں صدی ہجری میں ہے؟

محدثین نے شیعہ راویوں سے روایت اس لیے لی ہے کہ شروع میں تشیع محض ایک سیاسی رجحان تھا جو بنو امیہ کے مقابلے میں اہل بیت کے لیے مسلمانوں کے بعض گروہوں میں موجود تھا۔ اور اس رجحان نے بہت بعد میں غلو کی صورت میں رافضیت کی شکل اختیار کی ہے۔

امام ابن حجر رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ شروع میں تشیع دو قسم کا تھا۔ ایک طرف وہ لوگ تھے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر ترجیح دیتے تھے لیکن یہ شیخین ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما کو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے افضل مانتے تھے۔ اور دوسرا گروہ وہ تھا کہ جو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مطلق فضیلت کے قائل تھے۔[1] لیکن ان دونوں گروہوں میں سے کوئی بھی شیخین یعنی ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما یا ازواج مطہرات یا صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو سب و شتم نہیں کرتے تھے۔

پس بخاری و مسلم میں کسی ایسے شیعہ راوی کی روایت نہیں ہے کہ جو رافضی ہو یا

---

[1] ابن حجر العسقلاني، أبو الفضل أحمد بن علي بن محمد بن أحمد (المتوفى: 852هـ) تهذيب التهذيب، دائرة المعارف النظامية، الهند، الطبعة الأولى، 1326هـ، 94/1

شیخین اور ازواج مطہرات پر لعن طعن کرتا ہو وغیرہ یا ان کی تکفیر کرتا ہو۔ امام ذہبی رحمہ اللہ نے بھی اس کا ذکر کیا ہے کہ محدثین بدعت کبری کے مرتکب سے روایت نہیں لیتے ہیں اور بدعت کبری کا ارتکاب کرنے والوں میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو شیخین پر زبان درازی کرتے ہیں۔[1] اور محدثین نے تو یہ بھی اہتمام کیا ہے کہ مذکورہ بالا دو گروہوں میں سے اس شیعہ راوی سے بھی روایت نہیں لی ہے کہ جو اپنے عقیدے کا داعی اور مبلغ ہو۔ شارح بخاری اور معروف محدث علامہ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب تہذیب میں یہی بات بیان کی ہے۔

مزید اگر کسی کو شیعہ راوی سے محدثین کے روایت کرنے کے اصولوں کے بارے جاننے کا اشتیاق ہو تو اس موضوع پر محمد خلیفہ الشرع کی کتاب "منهج الإمامين البخاري ومسلم في الرواية عن رجال الشيعة في صحيحيهما" اور کریمہ سودانی کی کتاب "منهج الإمام البخاري في الرواية عن المبتدعة من خلال الجامع الصحيح : الشيعة أنموذجا" کا مطالعہ کر لینا چاہیے۔

منکرین حدیث کون ہیں؟

دوست نے کہا کہ چند حدیثوں کے انکار سے کوئی منکر حدیث تھوڑا ہو جاتا ہے۔ ہم نے عرض کیا کہ ہاں! ٹھیک کہتے ہو، چند آیتوں کے انکار سے کوئی منکر قرآن تھوڑا ہو جائے گا؟ اس نے کہا کہ یہ کیا بات ہوئی! میں نے کہا کہ وہی بات ہوئی کہ جو آپ نے کی۔ جیسی منطق ویسا جواب۔

امر واقعہ یہ ہے کہ اگر کوئی حدیث اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو جائے اور اس کے ثبوت پر محدثین اور فقہاء کا اتفاق ہو تو اس ایک روایت کا انکار کرنے والا بھی منکر حدیث ہی کہلائے گا۔

یہ امت اپنی اجتماعی حیثیت میں معصوم ہے کہ اللہ عزوجل نے اسے ﴿شُهَدَاءَ عَلَى

[1] الذهبي، شمس الدين أبو عبد الله محمد بن أحمد بن عثمان بن قَايْماز (المتوفى: 748هـ)، ميزان الاعتدال في نقد الرجال، دار المعرفة للطباعة والنشر، بيروت، الطبعة الأولى، 1382 هـ - 1963 م، 6/1

النَّاسِ﴾ بنایا ہے[1] اور یہ شہادت اس دنیا میں تو اسی صورت قائم ہو سکتی ہے جبکہ یہ امت اجتماعی حیثیت میں معصوم قرار پائے۔ اگر امت اپنی اجتماعی حیثیت میں بھی غلط ہو سکتی ہے تو یہ دوسروں پر اللہ کے دین کے معاملے میں کبھی گواہ نہیں بن سکتی۔ البتہ یہ بات درست ہے کہ بعض احادیث کا انکار کر دینا اور تمام احادیث کا انکار کر دینا تو یہ دونوں رویے اپنی شناعت میں برابر نہیں ہیں کہ دوسرا پہلے سے کہیں زیادہ شنیع فعل ہے۔

صحیح بخاری کے قلمی نسخے

اہل تشیع اور منکرین حدیث اہل سنت سے صحیح بخاری کے اصل قلمی نسخے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ امر واقعہ یہ ہے کہ صحیح بخاری کو نوے ہزار لوگوں نے ان کی زندگی میں ان سے سنا[2] تو اب بھی انہیں قلمی نسخے کی ضرورت ہے کیا؟ بھئی! ایسا قلمی نسخہ تو قرآن مجید کا بھی ہمارے پاس نہیں کہ جو اللہ کے رسول ﷺ لکھوا کر گئے ہوں۔ نہ جمع ابی بکر الصدیق موجود ہے، نہ حضرت عثمان کا نسخہ رضی اللہ عنہم بلکہ جو کچھ قدیم مصاحف میں سے موجود ہے تو وہ پہلی یا دوسری صدی ہجری کے مصاحف ہیں۔ تو کیا صرف اس بات پر قرآن مجید کا انکار کر دیں؟

اگر قرآن مجید قولی تواتر سے ثابت ہو سکتا ہے تو صحیح بخاری نہیں؟ اب نوے ہزار کی روایت سے تواتر حاصل نہ ہو گا کیا؟ اور قرآن مجید کی طرح بخاری کے حفاظ ہر دور میں رہے ہیں اور خود امام بخاری رحمہ اللہ لاکھوں حدیثوں کے حافظ تھے تو ان کے شاگرد جو خود کبار محدثین تھے، ہزاروں روایتوں کے حافظ نہیں ہو سکتے تھے کیا؟ حفظ تو کجا آج بھی بلاد مغرب مراکش وغیرہ میں صحیح بخاری کی باقاعدہ تلاوت کی جاتی ہے۔

ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں کہ ہمارا دین اصل میں حفظ و نقل، تحمل واداء اور تلقی و تلاوت سے منتقل ہوا ہے نہ کہ کتابت سے۔ کتابت تو اس کے انتقال کا ایک اضافی ذریعہ

---

[1] البقرة: 2: 143؛ الحج: 22: 78

[2] الخطيب البغدادي، أحمد بن علي بن ثابت بن أحمد بن مهدي (المتوفى: 463هـ)، تاريخ بغداد، دار الغرب الإسلامي، بيروت، الطبعة الأولى، 1422هـ - 2002م، 322/2

رہا ہے۔ لہذا دین میں کتابت کی شرط لگائیں گے تو قرآن مجید تک غیر محفوظ ہو جائے گا کہ اس وقت دنیا میں تین نسخے ایسے ہیں کہ جن کے بارے دعوی ہے کہ وہ مصحف عثمانی ہے اور تینوں نسخوں پر ﴿فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللَّهُ﴾ کے الفاظ پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خون کے نشانات ہیں۔ پس قرآن مجید اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جن چیزوں پر لکھا گیا، وہ آج ہمارے پاس محفوظ نہیں ہیں البتہ ان صحف سے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا مصحف تیار ہوا۔ اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا مصحف بھی موجود نہیں ہے البتہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے مصحف سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مصاحف تیار ہوئے۔ آج حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مصاحف بھی موجود نہیں ہیں البتہ مصاحف عثمانیہ کی روشنی میں تیار ہونے والے مصاحف موجود ہیں۔[1]

تو ہمارا دین نسخوں سے منتقل نہیں ہوا، یہ نسخے تو کمزور لوگوں کے لیے تیار کیے گئے تھے جبکہ علماء شروع سے ہی حفاظ قرآن بھی ہوتے تھے اور حفاظ حدیث بھی بلکہ حفاظ علوم بھی۔ اور آج بھی ہماری درس گاہوں میں حفاظ قرآن اور حفاظ حدیث تو کجا تفسیر، نحو اور منطق جیسی درسی کتابوں کے حافظ بھی مل جاتے ہیں۔ اس دین کے نقل ہونے کا طریقہ جس دن آپ کو سمجھ آجائے گا تو اس دن آپ کا بخاری سے بغض بھی ختم ہو جائے گا۔ اور بخاری کے قلمی نسخوں کے بارے دوسری بات اگلی تحریر میں۔

صحیح بخاری کا قدیم ترین نسخہ

بعض مفکرین کا دعوی ہے کہ ہمارے پاس بخاری کا کوئی ایک بھی محفوظ قلمی نسخہ موجود نہیں ہے۔ جو موجود ہیں، ان میں بھی باہمی اختلافات ہیں کہ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بخاری کے کاتبوں نے اپنی طرف سے حدیثیں صحیح بخاری میں شامل کر دیں کہ جسے علمی اصطلاح میں الحاق کہتے ہیں۔ لہذا آج ہمارے پاس جو بخاری موجود ہے، وہ امام بخاری رحمہ اللہ کی چھوڑی ہوئی صحیح بخاری نہیں ہے۔

---

[1] سحر السيد عبد العزيز سالم، أضواء على مصحف عثمان بن عفان رضي الله عنه ورحلته شرقا وغربا، مؤسسة شباب الجامعة، الإسكندرية، 1991م، ص 22

امر واقعہ یہ ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ سے نوے ہزار لوگوں نے صحیح بخاری کی سماعت کی کہ جن میں سے محمد بن یوسف الفربری، ابراہیم بن معقل النسفی، ابن سویہ حماد بن شاکر، منصور بن محمد البزدوی اور حسین بن اسماعیل المحاملی رحمہم اللہ امام بخاری سے صحیح بخاری روایت کرنے میں معروف ہیں۔[1]

محمد بن یوسف الفربری رحمہ اللہ نے تین سال تک امام بخاری رحمہ اللہ سے صحیح بخاری کی سماعت فرمائی اور الفربری رحمہ اللہ سے بے شمار لوگوں نے صحیح بخاری کی سماعت کی لیکن ان سے صحیح بخاری کو روایت کرنے میں جو لوگ معروف ہیں، ان میں ابراہیم بن احمد المستملی، ابن حمویہ عبد اللہ بن احمد، محمد بن مکی الکشھمینی، ابن شبویہ محمد بن عمر، سعید بن عثمان البزار، محمد بن احمد المروزی اور محمد بن محمد الجرجانی رحمہم اللہ شامل ہیں۔[2]

الفربری رحمہ اللہ کے شاگرد المستملی رحمہ اللہ کہتے ہیں:

انتسخت كتاب البخاري من أصله كما عند ابن يوسف، فرأيته لم يتم بعد، وقد بقيت عليه مواضع مبيضة كثيرة، منها تراجم لم يثبت بعدها شيئا، ومنها أحاديث لم يترجم عليها، فأضفنا بعض ذلك إلى بعض.[3]

"میں نے صحیح بخاری کو اس کے اصل نسخے سے نقل کیا ہے جو کہ الفربری کے پاس تھا۔ میں نے وہ نسخہ دیکھا کہ وہ ابھی تک مکمل نہیں تھا اس معنی میں کہ اس میں کچھ جگہیں خالی تھیں۔ بعض مقامات پر ترجمۃ الباب تھا لیکن اس کے نیچے کوئی حدیث نہیں تھی۔ اور بعض مقامات پر احادیث تھیں لیکن ان پر ترجمۃ الباب نہیں تھا۔ تو ہم نے وہ ترجمۃ الباب کہ جس کے نیچے احادیث نہیں تھیں، اسے وہاں درج کر دیا کہ جہاں احادیث تھیں لیکن ترجمۃ الباب نہیں تھا۔"

---

[1] محمد بن عبد الكريم بن عبيد، روايات ونسخ الجامع الصحيح للإمام أبي عبد الله محمد بن إسماعيل البخاري دراسة وتحليل، دار إمام الدعوة، الرياض، 1426ھ، ص 19، 21-22

[2] ايضا: ص 20-21

[3] الباجي، أبو الوليد سليمان بن خلف بن سعد بن أيوب الأندلسي (المتوفى: 474ھ)، التعديل والتجريح لمن خرج له البخاري في الجامع الصحيح، دار اللواء للنشر والتوزيع، الرياض، الطبعة الأولى، 1406 – 1986، ص 310-311

امام بخاری رحمہ اللہ اپنی زندگی میں ہی صحیح بخاری لکھوا چکے تھے اور انہوں نے اسے مکمل کرنے کے بعد امام احمد بن حنبل، یحی بن معین اور علی بن مدینی رحمہم اللہ جیسے جلیل القدر ائمہ محدثین کی خدمت میں پیش بھی کیا تو ان تمام محدثین نے چار احادیث کے علاوہ جمیع احادیث کو صحیح قرار دیا۔

اسی طرح الفربری رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ میں نے اپنی صحیح بخاری میں کوئی حدیث ایسی نہیں لکھی ہے کہ جس سے پہلے غسل کر کے دو رکعت نماز استخارہ نہ پڑھی ہو۔ تو یہ بہت واضح دلیل ہے کہ صحیح بخاری کو امام صاحب اپنی زندگی میں مکمل کر چکے تھے۔

البتہ بعض تراجم بیان کر کے امام صاحب ان کے تحت کوئی حدیث لانا چاہتے تھے لیکن جب نہیں ملی تو انہوں نے اس کی جگہ خالی چھوڑ دی۔ یا بعض احادیث پر وہ کوئی جامع ترجمۃ الباب قائم کرنا چاہتے لیکن جب ان کے ذہن میں ان احادیث سے اخذ ہونے والے متنوع مسائل کے لیے کوئی جامع ترجمۃ الباب نہیں آیا تو انہوں نے ترجمۃ الباب کی جگہ خالی چھوڑ دی۔

اب الفربری رحمہ اللہ کے شاگردوں نے یہ کام کیا کہ جہاں ترجمۃ الباب کے نیچے احادیث نہیں تھیں، اس ترجمۃ الباب کو وہاں سے اٹھایا اور وہاں رکھ دیا کہ جہاں احادیث تھیں اور وہاں ترجمۃ الباب نہیں تھا۔ تو صحیح بخاری میں کسی نے کوئی اضافہ یا الحاق نہیں کیا، البتہ یہ ہوا ہے کہ تقدیم و تاخیر کر دی ہے۔ اسی لیے ابو الولید الباجی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ الفربری رحمہ اللہ سے جن چار لوگوں نے صحیح بخاری کو روایت کیا ہے، ان کی روایت میں تقدیم و تاخیر کا اختلاف ہے کہ حدیثیں آگے پیچھے ہیں یا ترجمۃ الباب آگے پیچھے ہے۔ اور یہ اختلاف ایسا نہیں ہے کہ جو موجب طعن ہو۔[1]

اور مولانا انور شاہ کاشمیری رحمہ اللہ فیض الباری میں لکھتے ہیں کہ صحیح بخاری کے انیس قدیم نسخے ہیں کہ جن میں تین تو امام بخاری کے حنفی شاگردوں کے ہیں کہ جن میں

---

[1] ایضا: ص 311

ابراہیم بن معقل النسفی الحنفی رحمہ اللہ اور حماد بن شاکر الحنفی رحمہ اللہ دونوں امام بخاری کے براہ راست شاگرد ہیں۔ اور تیسرا شمس الدین صغانی رحمہ اللہ کا ہے۔[1]

امام بخاری سے اللہ کے رسول ﷺ کے نام پر بغض رکھنے والوں کی خدمت میں

بعض مفکرین صحیح بخاری کی بعض احادیث کو بنیاد بنا کر امام بخاری رحمہ اللہ سے جو بغض کا اظہار کر رہے ہیں تو اس کا سبب اللہ کے رسول ﷺ کی محبت بیان کر رہے ہیں۔ تو ان سے عرض ہے کہ کبھی تنہائی میں اس پر غور کرنا کہ کیا امام بخاری رحمہ اللہ ان روایات یا احادیث کو اپنی کتاب میں نقل کرنے کے سبب اللہ کے رسول ﷺ کی نظروں میں قیامت والے دن ایسے ہی مبغوض ٹھہریں گے جیسا کہ آج اس دنیا میں تمہارے دلوں میں ان کے بارے میں کینہ ہے؟

اگر ہاں تو اللہ تعالی کبھی صحیح بخاری کو وہ مقام نہ دیتا جو اسے اس امت میں حاصل ہے کہ مبغوضِ رسول، رسول ﷺ کی پہچان کا مقبول اور معروف ترین واسطہ بن جائے! ممکن نہیں ہے۔ اور اگر نہیں تو پھر اپنے آپ کو سمجھاؤ کہ جب آخرت میں وہ اللہ کے رسول ﷺ کے محبین میں سے ہوں گے تو پھر تم بخاری کے تذکروں سے اپنا خون کیوں جلا رہے ہو؟ ریلیکس رہو، کھاؤ پیو، لائف کو انجوائے کرو۔ اور بخاری کے بغض میں اپنے عشقِ رسول کی ایڈورٹزمنٹ کی بجائے کوئی مثبت کام کر لو تو سب روایت پسند تمہارے لیے دعائیں کریں گے۔

صحیح بخاری کا مقام علمائے دیوبند کی نظر میں

سوال: صحیح بخاری شریف ایک صحیح کتاب ہے کیا آپ کے پاس اس کی کوئی دلیل یا ثبوت ہے؟ برائے کرم قرآن اور حدیث یا اقوال یا اسلامی کتابوں سے، صحابہ کرام،

---

[1] (أمالي) محمد أنور شاه بن معظم شاه الكشميري الديوبندي (المتوفى: 1353هـ)، فيض الباري على صحيح البخاري، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى، 1426 هـ - 2005م، ص 33

تابعین، تبع تابعین رضوان اللہ تعالی علیہم اجمعین سے دلیل عنایت فرماویں کہ صحیح بخاری شریف ایک مستند کتاب ہے، اور دلیل یا ثبوت ان لوگوں کی جانب سے نہیں ہونے چاہئیں جو کہ تبع تابعین کے بعد پیدا ہوئے ہیں۔

جواب: بخاری شریف اپنی مختلف خصوصیات کی بنا پر قرآنِ کریم کے بعد سب سے زیادہ صحیح کتاب ہے، یہ کتاب آپ ﷺ اور اصحاب کے زمانے میں تو تھی نہیں، تو پھر بخاری شریف کے بارے میں فرمانِ نبوی اور اقوالِ صحابہ کہاں ملیں گے؟ البتہ بخاری شریف یہ آپ ﷺ کی احادیث کا مجموعہ ہے اور اس میں بھی وہ احادیث ہیں جن کی صحت میں شبہ نہیں۔ واضح رہے کہ احادیث سب ہی صحیح ہوتی ہیں، اس میں جو ضعف آتا ہے وہ راویوں کی وجہ سے آتا ہے۔ تو امام بخاری رحمہ اللہ نے جو احادیث نقل کی ہیں، اس میں راوی وغیرہ انتہائی ثقہ ہیں، جس سے اس میں موجود احادیث کے حدیثِ رسول ہونے میں شبہ نہیں رہ جاتا۔ اور جو بات حدیث ہو اس کے صحیح ہونے میں قرآن کی آیات بھی ہیں، احادیث بھی ہیں، اقوال صحابہ بھی ہیں۔ بخاری شریف کی صحت پر اجماعِ امت ہے، اور اجماع یہ حجت شرعیہ ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ کے معاصرین اور اس کے بعد کے معتبر علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ وہ اصح الکتب بعد کتاب اللہ ہے۔ بخاری لکھنے کا آغاز ۲۱۷ھ میں ہوا اور سولہ سال میں یہ کتاب مکمل ہوئی۔[1]

کیا صحیح بخاری منزل من اللہ ہے کہ اس میں کوئی غلطی نہیں؟

جب بھی حدیث کا دفاع کیا جائے تو منکرین حدیث عموماً یہ سوال کرتے ہیں۔ تو پہلی بات یہ واضح رہے کہ صحیح بخاری کے دو گتوں کے مابین جو کچھ ہے، اس سب کو کوئی بھی "منزل من اللہ" نہیں کہتا۔ صحیح بخاری میں "منزل من اللہ" ہے نہ کہ کل صحیح بخاری "منزل من اللہ" ہے۔

[1] Hadith wa Sunnat, Dar ul Ifta Dar ul Uloom Deoband, India, QA No. 11124, Retrieved 01 November 2016 from http://www.darulifta-deoband.com/home/ur/Hadith--Sunnah/11124

دوسری اور اہم تر بات یہ ہے کہ حدیث کو وحی کہا جاتا ہے نہ کہ صحیح بخاری کو۔ اور صحیح بخاری میں حدیث موجود ہے نہ کہ صحیح بخاری کی ہر بات حدیث ہے۔ حدیث سے مراد وہ روایت ہے کہ جس میں اللہ کے رسول ﷺ کا قول، فعل اور تقریر موجود ہو اور صحیح بخاری میں صحابہ کے اقوال بھی ہیں اور تابعین کے بھی۔ سلف کے اقوال بھی ہیں اور ائمہ کے بھی۔

تیسری اور اہم تر بات یہ ہے کہ حدیث کو لفظی وحی کوئی بھی نہیں کہتا بلکہ حدیث معنوی وحی ہے۔ پس حدیث کا معنی "منزل من اللہ" ہے جبکہ حدیث کے الفاظ اللہ کے رسول ﷺ کے ہوتے ہیں اگر وہ قولی سنت ہو۔ اور اگر فعلی یا تقریری سنت ہو تو حدیث کے الفاظ صحابی کے ہوتے ہیں۔ حدیث میں اگرچہ اللہ کے رسول ﷺ کے الفاظ کو محفوظ رکھنے کا اہتمام کیا گیا ہے اور بہت حد تک محفوظ بھی ہیں لیکن اصل بات یہی ہے کہ اس میں معنی محفوظ ہے۔

منکرین حدیث عموماً اپنی نقد میں ان اصولی باتوں کا لحاظ نہیں رکھتے۔ مثال کے طور وہ صحیح بخاری پر یوں نقد کریں گے کہ اس میں یہ واقعہ موجود ہے کہ ایک بندر نے زنا کیا تو بقیہ بندروں نے اس کو رجم کر دیا۔[1] اب امام بخاری رحمہ اللہ نے اس واقعے کو عمرو بن میمون تابعی رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ میں نے ایک دفعہ یمن میں ایسے ایسے دیکھا۔ اور وہ دیکھا بھی زمانہ جاہلیت میں ہے۔ اب یہ حدیث ہے ہی نہیں بلکہ ایک تابعی کا مشاہدہ ہے، اگرچہ واقعہ بخاری میں موجود ہے۔

رہی بات صحیح بخاری پر نقد کی تو ائمہ فن نے اس کی روایات پر نقد کی اور ائمہ فن نے ہی اس نقد کا جواب بھی دے دیا ہے۔ اور اب اس نقد اور دفاع سے یہ متعین ہو گیا ہے کہ صحیح بخاری میں کلام کی گنجائش کہاں کہاں ہے اور اس کا جواب کیا کیا ہے؟ یہ عمل علم کی دنیا میں ایک ہزار سال کے عرصے میں مکمل ہو چکا۔ اب آپ صحیح بخاری پر کوئی نیا

---

[1] عَنْ عَمْرِو بْنِ مَيْمُونٍ، قَالَ: «رَأَيْتُ فِي الجَاهِلِيَّةِ قِرْدَةً اجْتَمَعَ عَلَيْهَا قِرَدَةٌ، قَدْ زَنَتْ، فَرَجَمُوهَا، فَرَجَمْتُهَا مَعَهُمْ» [صحيح البخاري: 44/5]

اعتراض پیدا نہیں کر سکتے اور جو پیدا ہوئے تھے، ان کا جواب موجود ہے۔

اسی لیے صحیحین کی احادیث پر نقد کے بارے اپنے ایک مفصل مضمون کا خلاصہ یہاں نقل کر رہا ہوں[1] کہ صحیحین پر ہونے والی کبار محدثین کی تمام نقد اور کبار محدثین ہی کی طرف سے اس کے جواب کے بعد ان دونوں کتب میں وہ مقامات متعین ہو گئے کہ جن میں کوئی علل پائی جاتی ہیں اور ان علل کے درجہ کا تعین بھی ہو گیا ہے کہ وہ علل قادحہ ہیں یا نہیں؟

اب اگر کوئی شخص امام الدار قطنی رحمہ اللہ یا ائمہ سلف میں سے کسی اور محدث کی بیان کردہ تحقیقات کی روشنی میں صحیح بخاری یا صحیح مسلم کی کسی حدیث پر نقد کرتا ہے تو اس کی یہ تنقید صحیحین پر کوئی مستقل بالذات تنقید شمار نہ ہو گی اور ایسی تنقید کا ائمہ سلف ہی میں سے بہت سے ائمہ نے کافی و شافی جواب دے دیا ہے۔

اور اگر کوئی شخص صحیحین کی کسی ایسی روایت پر تنقید کرتا ہے کہ جس پر ائمہ سلف میں سے کسی نے بھی کلام نہ کیا ہو تو ایسا شخص اجماع محدثین کی مخالفت کر رہا ہے کیونکہ جن روایات پر محدثین نے نقد نہ کی تو اس سے یہ طے ہو گیا کہ تمام محدثین کے نزدیک یہ روایات صحیح ہیں لہذا ان روایات پر کلام کرنا جمیع محدثین کے دعوی صحت کو چیلنج کرنا ہے اور ایسا دعوی ہی ناقابل التفات ہے چہ جائیکہ اس کی تحقیق کی جائے۔

نکاح کے وقت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی عمر

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ہی مروی متفق علیہ روایت کے مطابق اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح کے وقت ان کی عمر چھ سال تھی جبکہ رخصتی کے وقت نو سال تھی۔[2] اس روایت پر ایک بڑا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ یہ ظلم ہے۔ طرفہ تماشا یہ ہے کہ جس پر ظلم ہونے کا دعوی کیا جاتا ہے، اس سے کوئی نہیں پوچھ رہا۔ یعنی عائشہ رضی اللہ عنہا نو سال

---

[1] محمد زبیر، حافظ، کیا صحیحین کی صحت پر اجماع ہے، ماہنامہ محدث، مارچ 2008ء، مجلس تحقیق اسلامی، لاہور، 3/40

[2] صحيح البخاري: 55/5

کی عمر میں رخصتی پر راضی، ان کے والد ابو بکر رضی اللہ عنہ اس پر راضی، ابو بکر رضی اللہ عنہ کے خاندان کے کسی فرد کو اعتراض نہیں، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم راضی۔ اب انہیں، دوسری دنیا کے لوگوں کو، یہ ظلم نظر آرہا ہے۔

قاری حنیف ڈار صاحب نے یہ اعتراض کیا ہے کہ یہ تو مانتے ہو کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا چھ سال کی عمر میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آئیں لیکن اپنی بیٹی چھ سال کی عمر میں کسی کے نکاح میں نہیں دیتے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ہاں! واللہ! اگر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہوتے تو چھ سال کی عمر میں اپنی بیٹی ان کے نکاح میں دینے میں آج بھی لاکھوں اپنے لیے سعادت سمجھتے۔

قاری حنیف ڈار صاحب کی خدمت میں عرض ہے کہ عام انسان اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں کچھ فرق سمجھیں۔ ایک امتی کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو ایمانی تعلق ہے، اسے کسی مرشد اور پیر سے جذباتی تعلق پر قیاس نہ کریں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جو خود اس روایت کی راویہ ہیں، انہوں نے کبھی اس پر افسوس کا اظہار کیا کہ وہ نو سال کی عمر میں کیوں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجیت میں آئیں؟ اور بعض لوگوں کو خواہ مخواہ کا بخار چڑھا جا رہا ہے۔

ایک پروفیسر صاحب نے کہا کہ امتی تو اپنی بیٹی دے دے گا لیکن رسول صلی اللہ علیہ وسلم لے نہیں سکتے۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ اتنے لوگ اگر کہہ رہے ہیں اور اتنی روایات اگر بیان کر رہی ہیں تو امکان تو ہے کہ قیامت دن معلوم ہو کہ ایسا ہی ہوا تھا تو اس وقت رسول کا رسول ہونا کیسے جسٹیفائی کرو گے؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نو سال کی عمر میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آئیں، اس کا جواب چاہیے تو وہ عقلی نہیں ایمانی ہے۔ آج اپنے آپ سے یہ سوال کر لیں کہ اگر بالفرض تم سے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم تمہاری بیٹی نو سال کی عمر میں مانگ لیتے تو تمہارا ردعمل کیا ہوتا؟ اور پھر یہ کہ تمہارا ردعمل جو ہوتا سو ہوتا لیکن یہ بھی سوچ لو کہ اگر ابو بکر کا ایمان ہوتا تو اس کا اس پر کیا ردعمل ہوتا؟

ہمیں یہ کہنے میں کوئی حرج محسوس نہیں ہوتا کہ مغربی عقلیت پرستی کے زیر اثر کچھ لوگوں کو یہاں مشرق میں جذبات کی مخالفت کا بخار چڑھا ہوا ہے حالانکہ انہیں یہ معلوم

نہیں کہ ایمان بھی ایک جذبہ ہی ہے۔ کائنات کا کل حسن جذبات میں ہے، اگر ایسا نہیں تو ہر زبان کے ادب کو اٹھا کر دریا میں پھینک دو۔ ہاں، ہاں، یہ کیا، جذباتی بات کر رہے ہو۔ تو کیا جذبات کے بغیر تمہارا ایمان مکمل تو کجا موجود بھی ہو سکتا ہے؟

ہماری نظر میں ہر سوال کا جواب نہ تو علمی ہوتا ہے اور نہ عقلی۔ بعض سوالوں کا جواب صرف ایمانی ہوتا ہے، جو صرف ایمان سے ہی دیا جا سکتا ہے اور محض ایمان ہی کی بدولت سمجھا جا سکتا ہے۔ اور مذہب کو اس کے بغیر چارہ نہیں ہے۔ اس نکتے کو اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے کیونکہ یہ تکمیل ایمان میں سے ہے۔ ایک دوست کا کیا خوب کہنا ہے کہ ایمان دلیل بھی ہے اور مدلول بھی لیکن اس جملے کو سمجھنے کے لیے بھی ایمان چاہیے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی عمر پر تحقیقی نظر از سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ

اپنے اس رسالے میں جناب سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ نے اپنے معاصرین میں سے منکرین اور متجددین کے ان دلائل کی خوب خبر لی ہے کہ جن سے یہ ثابت کیا جا رہا تھا کہ نکاح کے وقت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی عمر بڑی تھی۔ یہ رسالہ سید صاحب کی کتاب سیرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے آخر میں موجود ہے کہ جسے مکتبہ اسلامیہ نے شائع کیا ہے۔ منکرین اور متجددین نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی عمر کے بارے میں صاحب مشکوۃ ولی الدین خطیب رحمہ اللہ کے ایک رسالہ "الإكمال في أسماء الرجال" کی ایک عبارت کو بطور دلیل پیش کیا ہے کہ جس کے مطابق حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اپنی بہن سیدہ اسماء رضی اللہ عنہا سے دس سال چھوٹی تھیں۔[1]

صاحب مشکوۃ کے رسالہ "الإكمال في أسماء الرجال" کی عبارت کے بارے سید صاحب کا کہنا ہے کہ صاحب مشکوۃ نے اس رائے کو "قیل" کے صیغے سے پیش کر کے اس کے مجہول اور ضعیف ہونے کی طرف اشارہ کیا تھا لیکن منکرین اور متجددین نے اسی قول کو اپنے حق میں دلیل بنا لیا جبکہ صاحب مشکوۃ کی اپنی رائے اس باب میں وہی ہے جو عام علماء کی رائے ہے کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا نکاح چھ سال کی عمر میں اور رخصتی نو سال کی

---

[1] سلمان ندوی، سید، سیرت عائشہ، دار الابلاغ، لاہور، 2010ء، ص 316

عمر میں ہوئی تھی۔[1]

سید صاحب نے لکھا ہے کہ احادیث میں صرف نو کا عدد نہیں ہے کہ جس کے بارے یہ دعوی کیا جا سکے کہ یہ انیس تھا اور راویوں نے اسے نو سمجھ لیا بلکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنے نکاح کے وقت کے احوال بھی بیان کیے ہیں کہ وہ ہنڈولے جھولتی تھیں، گڑیاں کھیلتی تھیں، اور ایک روایت میں "جارية حديثة السن" کے الفاظ بھی ہیں۔ یعنی طرح طرح کے الفاظ اور قرائن سے نکاح کے وقت ان کے چھوٹے ہونے کی تصدیق ہوتی ہے۔[2]

سید صاحب کا یہ بھی کہنا ہے کہ عربوں میں نہ صرف کمسن بچیوں کے نکاح کا رواج تھا بلکہ شیر خوار بچوں کا بھی وہ نکاح کر دیتے تھے بلکہ ان بچوں کا بھی ان کے ہاں نکاح کر دیا جانا عام تھا کہ جو ابھی حمل میں ہوتے تھے جیسا کہ سنن ابو داؤد میں تو باقاعدہ ایک باب "باب في تزويج من لم يولد" کے عنوان سے موجود ہے کہ جس میں ان بچیوں کے نکاح کا تذکرہ ہے کہ جو ابھی پیدا بھی نہیں ہوئی تھیں۔

سید صاحب نے امام رازی رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے کمسن لڑکے سلمہ رضی اللہ عنہ کا نکاح حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی نابالغ لڑکی سے پڑھایا تھا۔ سید صاحب نے علامہ عینی رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ قدامہ بن مظعون رضی اللہ عنہ نے حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ کی نو مولود لڑکی سے نکاح پڑھوایا تھا۔ سید صاحب کا یہ رسالہ اس موضوع پر ایک تحقیقی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔[3]

حدیثوں پر غیرت اور ان کا انکار

عجب حال ہے کہ جنہیں حدیثوں پر غیرت آتی ہے اور اس غیرت کے سبب حدیثوں کا انکار شروع کر دیتے ہیں، انہیں آیتوں پر غیرت نہیں آتی بلکہ وہاں ایمان یاد آ

---

[1] ایضا: ص 317-318
[2] ایضا: ص 341
[3] ایضا: 339

جاتا ہے۔ چھوٹی عمر کی لڑکی کا نکاح تسلیم نہیں ہے کیونکہ یہ حدیث میں آیا ہے لیکن چھوٹی عمر کے لڑکے کو بلاوجہ قتل کرنے پر ہم ایمان لائیں گے کہ یہ قرآن میں آیا ہے۔ یہ وہ تذبذب ہے کہ جس کا شکار آج کل کے منکرین حدیث اور متجددین ہیں۔

حضرت خضر علیہ السلام کا نابالغ بچے کو قتل کرنا، حضرت جبرئیل کا مریم علیہا السلام کی تنہائی میں مرد کی صورت میں آجانا، حضرت لوط علیہ السلام کا اپنی بیٹیوں کو اپنی قوم پر پیش کرنا وغیرہ جیسے قرآنی واقعات میں توہین، عقل، منطق سب بھول جاتا ہے، صرف ایمان یاد رہ جاتا ہے۔ تو غیرت، عقل اور منطق کے جس ترازو سے حدیث کو تول رہے ہیں، اسی ترازو سے اگر قرآن مجید کو بھی تولیں گے تو اپنے بوجھے میں کچھ نہیں بچے گا سوائے الحاد کے۔

اور حقیقت یہی ہے کہ رویے اصل میں دو ہی ہیں یا ایمان یا الحاد۔ اور جو ان کے بیچ کا ہے تو وہ یا تو منافقت ہے یا پھر وسعت مطالعہ کی کمی ہے کہ حدیث کے خلاف جتنے اعتراضات سوجھ رہے ہیں، وہ سب قرآن مجید کے خلاف مستشرقین بہت پہلے ہی نقل فرما چکے ہیں۔ قرآن بھی خبر ہے اور حدیث بھی خبر ہے۔ خبر کے اصولوں پر دونوں کو پرکھ لیں۔ اگر حدیث کو غیرت اور عقل کے اصولوں پر پرکھیں گے اور اپنے اس رویے میں مخلص ہوئے تو ضرور بالضرور قرآن کا بھی انکار کریں گے کہ قرآن میں وہ باتیں زیادہ صراحت سے موجود ہیں کہ جن کا آپ احادیث میں انکار کر چکے ہیں۔

حضرت خضر علیہ السلام کا واقعہ اگر حدیث میں منقول ہوتا تو لازماً اس کا انکار کر دیا جاتا لیکن چونکہ قرآن مجید میں نقل ہو گیا تو اب درایت و روایت کے سارے اصول بھول گئے اور محیر العقول تفصیلات اور خلافِ عقل امور کو وحی الہی تسلیم کر لیا گیا۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ دین کے ثبوت کا اصل ذریعہ خبر مقبول ہے۔ اور جب خبر مقبول سے دین ثابت ہو گیا تو چاہے وہ خبر قرآن مجید کی ہو یا حدیث کی، اس کو ماننا پڑے گا کہ یہی ایمان کا تقاضا ہے۔ اور کئی اور مقامات پر ہم اس موضوع پر تفصیل سے بحث کر چکے ہیں۔[1]

[1] فکر غامدی: ایک تحقیقی وتجزیاتی مطالعہ، ص 21-71

لڑکی کی رضامندی کی قانونی عمر

مختلف ممالک میں لڑکی سے رضامندی کا تعلق (the age of consent) قائم کرنے کے لیے مختلف عمر کو قانونی حیثیت دی گئی ہے۔ شمالی امریکہ، فلپائن اور انگولا میں یہ قانونی عمر 12 سال ہے۔ اور جاپان، ایران، نائیجر اور ارجنٹینا میں یہ عمر قانونی طور 13 سال ہے۔ اور جرمنی، آسٹریا، بلغاریہ، ہنگری، پرتگال، مقدونیہ، ایسٹونیا، البانیا، بوسنیا، اسرائیل، چین، بنگلہ دیش وغیرہ میں یہ 14 سال ہے۔ اور 15 اور 16 سال کی قانونی عمر تو آدھی سے زیادہ دنیا میں ہے۔[1] اور یہ تو آج کی متمدن دنیا کے ہم احوال بیان کر رہے ہیں جبکہ آپ ان قوموں کی تاریخ اٹھا کر دیکھیں تو معلوم پڑتا ہے کہ اس قانونی عمر کا تقرر بھی اچھی خاصی جدوجہد کا نتیجہ ہے۔

اور یہ بحث کرنے کا مقصد یہ ہے کہ غلامی کے بارے میں مصادرِ احادیث میں جو روایات مروی ہیں، اگر ان کا تقابل آج کل کے تصورِ آزادی سے کریں گے تو اسلام پر طعن کرنا بہت آسان ہو جائے گا لیکن اگر احادیث میں مروی غلامی کے تصور کا اُسی دور کی معاصر اقوام میں رائج غلامی سے تقابلی مطالعہ کریں گے تو اسلام سے بڑی نعمت کوئی نہ معلوم ہو گی۔ پس ایک یہ ہے کہ اُس دور میں نکاح اور شادی بیاہ کے بارے میں کلچر اور رسوم ورواج کیا تھے؟ اور ایک یہ ہے کہ آج کے رسوم ورواج اور ثقافت کیا ہے؟ تو ظاہری بات ہے کہ دونوں میں فرق ہے۔۔ تو کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ایک ہی بات کو دیکھنے کے دسیوں زاویے ہو سکتے ہیں لہذا ایک ہی زاویے سے کسی بات کو دیکھ کر اس پر کوئی قطعی حکم لگا دینا بالکل بھی مناسب نہیں ہے۔ اور دیکھنے کا ایک زاویہ یہ ہے کہ جس دور کی بات ہے، اس دور کے حالات میں اتر کر اس بات کے بارے کوئی مثبت یا منفی تبصرہ کیا جائے۔

ناقدین کو حدیثوں میں ایک مثال ملی تو چڑھائی کر دی کہ نو سال میں شادی کیسے ہو

[1] Unknown, Minimum age of sexual consent, Retrieved 31 October, 2016, from http://www.unicef.org/lac/2._20160308_UNICEF_LACRO_min_age_of_sexual_consent.pdf

سکتی ہے۔ تو یہ جو ایشیا، افریقہ اور جنوبی امریکہ میں بارہ اور تیرہ اور یورپ میں چودہ سال کی عمر میں قانون کی چھتری تلے بڑے پیمانے پر ہو رہا ہے، کبھی اس پر سوال یا اعتراض کی جرات ہوئی کہ یہ کیسے ممکن ہے؟ تیرہ یا چودہ سال کی لڑکی شادی کے قابل ہوتی ہے؟ اگر ہوتی ہے تو کیا اپنی بیٹی کا نکاح اس عمر میں کرنا پسند کریں گے؟ یہ وہ انداز ہے کہ جو منکرین حدیث عام طور حدیث پر اعتراض کرتے وقت اختیار کرتے ہیں۔

شکریہ قاری حنیف ڈار صاحب

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے نکاح کے وقت کی عمر کی متفق علیہ احادیث پر ایک تنقیدی پوسٹ قاری حنیف ڈار صاحب نے لگائی۔ دراصل متقدمین مفسرین، فقہاء اور محدثین کا اتفاق ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے نکاح کے وقت ان کی عمر چھوٹی تھی جیسا کہ روایات میں بیان ہوا ہے اور اس مسئلے میں انہوں نے قرآن مجید کی اس آیت سے بھی دلیل پکڑی ہے کہ جس میں ان عورتوں کی عدت بیان ہوئی ہے کہ جنہیں حیض نہیں آیا۔ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿وَاللَّائِي يَئِسْنَ مِنَ الْمَحِيضِ مِن نِّسَائِكُمْ إِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلَاثَةُ أَشْهُرٍ وَاللَّائِي لَمْ يَحِضْنَ﴾[1]

”تمہاری عورتوں میں سے جو عورتیں حیض سے ناامید ہو گئی ہوں، اگر تمہیں شبہ ہو تو ان کی عدت تین مہینے ہے اور ان کی بھی جنہیں حیض آنا شروع ہی نہ ہوا ہو۔“

اس دلیل پر پہلے قاری صاحب کا تبصرہ ملاحظہ فرمائیں۔ پھر ہم کچھ عرض کریں گے۔

”جو آیت کوٹ کی جاتی ہے سورہ الطلاق کی (4)، ذرا اس کی شروعات دیکھیے اور ہمارے بزرگوں کی ترجمانیاں دیکھیے، یہ بات سمجھنے کے لئے مفتی ہونے کی ضرورت نہیں بس عقل ہونے کی ضرورت ہے کہ بات عورتوں کی ہو رہی ہے بچیوں کی نہیں، اور 8 یا 9 یا 10 سال کی بچی کو عربی میں کبھی نساء اور اردو

[1] الطلاق: 65: 4

میں کبھی عورت نہیں کہتے اور اللہ پاک فرمارہے ہے کہ تمہاری عورتوں میں سے جو حیض سے خشک ہو گئی ہیں یا وہ کہ جن کو کسی بیماری یا کسی عذر کی وجہ سے حیض آیا ہی نہیں وہ سدا سے خشک ہیں ان کی عدت تین حیض کی بجائے تین ماہ ہے۔"

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب قول کے علاوہ تابعین میں سے سدی، قتادہ، ضحاک اور مقاتل بن سلیمان رحمہم اللہ نے قرآنی الفاظ "لم یحضن" سے مراد وہ بچیاں لی ہیں کہ جو حیض کی عمر کو نہ پہنچی ہوں۔ علاوہ ازیں امام ابن جریر طبری، امام قرطبیؒ، امام بیضاوی، امام بغوی، امام ابن کثیر، امام سیوطی، امام رازی، امام نسفی، امام ابو حیان الاندلسی، امام ابن عطیہ، امام شوکانی، امام بقاعی، امام ابو السعود، علامہ ابن جوزی، علامہ زمخشری، علامہ مراغی، علامہ مظہری، علامہ صدیق حسن خان، علامہ طنطاوی، علامہ الجزائری اور سید قطب رحمہم اللہ اور ان کے علاوہ بہت سے عربی مفسرین نے بھی اس آیت سے مراد وہ بچیاں لی ہیں کہ جنہیں چھوٹی عمر ہونے کی وجہ سے حیض نہ آیا ہو۔

پہلے تو انہوں نے ہمارے علم میں یہ اضافہ فرمایا تھا کہ سلف کی قرآن فہمی درست نہیں ہے۔ اور اب ماشاء اللہ! یہ بھی بتلا دیا ہے کہ سلف کو عربی نہیں آتی تھی۔ یعنی ابن جریر طبری، علامہ زمخشری، ابو حیان اندلسی، ابن عطیہ رحمہم اللہ جیسے ماہرین لغت اور بلاغت بھی اتنی عربی نہیں جانتے تھے کہ جتنی کامن سینس رکھنے والے گجرات کے ایک قاری صاحب کے پاس ہے۔ شکریہ قاری صاحب! آپ واقعتاً چھا گئے ہیں۔ کیا آج سے ہم اہل عرب سے یہ گزارش کر لیں کہ عربی زبان کے الفاظ انہی معانی میں استعمال کریں کہ جو قاری صاحب نے متعین کر دیے ہوں؟

بکری کے قرآن مجید کی آیات کھا جانے کی روایت

ایک دوست نے سنن ابن ماجہ کی ایک روایت کے بارے سوال کیا ہے کہ جس میں یہ ذکر ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی بکری قرآن مجید کی بعض آیات کھا گئی تھی تو کیا یہ

صحیح روایت ہے؟[1] تو اس بارے عرض ہے کہ حدیث کی کتابوں میں کوئی حدیث نقل ہو جانے کا مطلب ہر گز یہ نہیں ہے کہ وہ حدیث صحیح بھی ہے۔ صحیحین کے علاوہ کتب احادیث میں ضعیف روایات بھی موجود ہیں اور موضوع (fabricated) بھی۔ جہاں تک مذکورہ بالا روایت کا معاملہ ہے تو محققین نے اس روایت کو محمد بن اسحاق کے تفرد اور مخالفتِ ثقات کے سبب مردود قرار دیا ہے لہذا ایسا کوئی واقعہ کسی صحیح روایت سے ثابت نہیں ہے۔[2]

اور اگر اس روایت کو صحیح مان بھی لیا جائے تو اس کی وجہ سے قرآن مجید پر کوئی طعن وارد نہیں ہوتا کہ اس روایت میں یہ ذکر ہے کہ جو آیات اس بکری نے کھائی تھیں، وہ منسوخ التلاوۃ آیات تھیں یعنی رجم کی آیات اور رضاعت کبیر کی آیات۔ اور منسوخ آیات کو ضائع کروا دینا اور ذہنوں سے بھلوا دینا، یہ اللہ کی ذمہ داریوں میں سے ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿مَا نَنسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا أَوْ مِثْلِهَا أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ﴾[3]

"ہم جس آیت کو منسوخ کر دیتے یا اسے فراموش کرا دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا ویسی ہی اور آیت بھیج دیتے ہیں۔ کیا آپ نہیں جانتے کہ اللہ عزوجل ہر بات پر قادر ہے۔"

رضاعت کبیر کے بارے روایات کی صحت

بعض صحیح روایات میں اس کا تذکرہ ہے کہ کسی ضرورت کے تحت کسی بڑے لڑکے کو دودھ پلا کر اپنا رضاعی بیٹا بنایا جا سکتا ہے لیکن کسی بھی صحیح روایت میں ایسا نہیں ہے کہ کوئی خاتون کسی بڑے لڑکے کو اپنے سینے سے لگا کر اسے دودھ پلا سکتی ہے بلکہ اس سے

---

[1] ابن ماجة، أبو عبد الله محمد بن يزيد القزويني (المتوفى: 273هـ)، سنن ابن ماجة، دار الرسالة العالمية، الطبعة الأولى، 1430 هـ - 2009 م، 125/3

[2] أيضا

[3] البقرة: 2: 106

مراد یہ ہے کہ کسی برتن میں نکال کر کسی بچے کو پلایا جاسکتا ہے جیسا کہ امام ابن عبد البر رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "الاستذکار" میں اس کا ذکر کیا ہے۔[1]

اور عصر حاضر میں تو باقاعدہ انسانی ملک بینک (human milk bank) وجود میں آچکے ہیں جیسا کہ امریکہ اور یورپ میں بہت بڑے پیمانے پر انسانی دودھ کو ڈبے کی دودھ کی طرح محفوظ کر کے اس کا کاروبار کیا جارہا ہے۔ اور کھلاڑی عموماً کھیلوں میں بہتر کارکردگی دکھانے کے لیے انسانی دودھ کا استعمال کرتے ہیں کہ اس میں انرجی زیادہ ہوتی ہے لیکن یہ سب درست نہیں ہے کہ اس سے رضاعت کے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن اس بات کا تذکرہ اس لیے کیا ہے کہ عورت کا اپنا دودھ نکال کر کسی اور کو پلا دینا یہ ایک عام سی بات ہے۔

رضاعت کبیر سے حرمت ثابت ہوتی ہے یا نہیں تو اس بارے علماء کا اختلاف ہے۔ جمہور علماء کہتے ہیں کہ حرمت ثابت نہیں ہوتی ہے۔ بعض کا کہنا یہ ہے کہ حرمت ثابت ہوتی ہے یعنی بڑی عمر کے بچے کو بھی اگر کوئی خاتون دودھ پلا دیں تو وہ ان کا رضاعی بیٹا بن جاتا ہے۔ اور بعض کا کہنا ہے کہ اگر ضرورت اور نیت ہو تو ثابت ہوتی ہے اور یہ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ، امام ابن قیم رحمہ اللہ اور علماء کی ایک جماعت کا قول ہے[2] اور یہی بہتر معلوم ہوتا ہے۔

حدیث میں رضاعت کبیر یعنی بڑی عمر کے بچے کو دودھ پلانے کا جو واقعہ نقل ہوا ہے تو اس میں بھی ضرورت کا بیان ہے۔ ایک صحابی ابو حذیفہ رضی اللہ عنہ نے ایک بچے سالم رضی اللہ عنہ کو بچپن سے گود لیا اور جب وہ بالغ ہو گیا تو ان کی بیوی سہلہ بنت سہیل رضی اللہ عنہا نے کہا کہ اب مجھے اس سے پردہ کرنا پڑے گا۔ لہذا انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مسئلہ پوچھا اور آپ نے خاتون اور بچے کے تعلق کو ملحوظ رکھتے ہوئے جواب دے دیا۔[3] اب ایک عورت نے ایک

---

[1] ابن عبد البر، أبو عمر يوسف بن عبد الله بن محمد النمري (المتوفى: 463هـ)، الاستذكار، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى، 1421 – 2000، 255/6

[2] ابن قيم الجوزية، محمد بن أبي بكر بن أيوب بن سعد شمس الدين (المتوفى: 751هـ)، زاد المعاد في هدي خير العباد، مؤسسة الرسالة، بيروت الطبعة السابعة والعشرون، 1415هـ /1994م، 527/5

[3] مالك بن أنس بن مالك بن عامر الأصبحي المدني (المتوفى: 179هـ)، موطأ الإمام مالك، مؤسسة زايد

بچے کو بچپن سے پالا پوسا ہو تو اس کا اس سے محبت، الفت اور مانوسیت کا ایک تعلق قائم ہو جاتا ہے کہ وہ گھر کا ایک فرد بن چکا ہوتا ہے۔

لہذا اس قسم کے حالات میں پردہ دین میں ایک مشقت پیدا کر دیتا ہے اور اگر بچے کو گھر سے باہر نکال کریں تو انسانی جذبات کا کیا کریں کہ یہ ایک دوسری بڑی مشقت ہے۔ تو اس کا علاج یہ بتلایا گیا کہ اگر ایسی خاتون ایسے بچے کو اپنا دودھ پلا کر اپنا رضاعی بیٹا بنا لیں تو اس کی اجازت ہے۔ لیکن دودھ کس طرح پلائیں، اس کی وضاحت اوپر ہو چکی ہے۔

اللہ نے آپ کو کسی ایسی آزمائش میں نہیں ڈالا تو اللہ کا شکر ادا کریں ورنہ تو اس اجازت کی اہمیت کو وہی شخص سمجھ سکتا ہے کہ جنہوں نے کسی سے بچہ لے کر پالا ہو۔ ایمان سے بتائیں کہ ایسا شخص ایسی حدیثوں کو سینے سے نہیں لگائے گا تو اور کیا کرے گا؟

غزوہ احد میں اللہ کے رسول ﷺ کے دندان مبارک کا شہید ہونا

دو دوستوں نے یہ سوال کیا ہے کہ کیا وہ روایت صحیح ہے کہ جس میں غزوہ احد میں اللہ کے رسول ﷺ کے سامنے کے دانتوں کے شہید ہونے کا تذکرہ ہے؟ اگر صحیح ہے تو ان روایات کا کیا کریں کہ جن میں ذکر ہے کہ آپ ﷺ جب مسکراتے تو سامنے کے دانت چمکتے تھے؟ اور اس اعتراض کا کیا کریں کہ نبی کی ذات میں کوئی عیب نہیں ہو سکتا۔

ہمیں یہ اعتراف ہے کہ ہمارے ہاں قرآن مجید کے تراجم جس محنت سے ہوئے ہیں، احادیث کے تراجم اس قدر محنت اور دقت نظری سے نہیں کیے گئے۔ یہ اشکال دراصل بعض مترجمین کے ترجمہ سے پیدا ہو کہ جنہوں نے اس واقعے میں مروی عربی الفاظ "رباعیـــة" کا ترجمہ سامنے کے دانت کر دیا ہے کہ جس سے تین غلط تاثر پیدا ہوئے کہ یہ "ثنایا" کی بات ہو رہی ہے، اور ثنایا علیا کی، اور دو دانتوں کی بات ہو رہی ہے۔

یہ روایت صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے علاوہ احادیث کے تقریباً تمام بنیادی مصادر

بن سلطان آل نہیان، أبو ظبي، الطبعة الأولى، 1425 هـ - 2004 م، كِتَابُ الرَّضَاعِ، بَابُ مَا جَاءَ فِي الرَّضَاعَةِ بَعْدَ الْكِبَرِ، 873/4

میں موجود ہے[1] بلکہ سیرت اور تاریخ کے بنیادی مصادر میں بھی موجود ہے۔ یہ واقعہ سیرت ابن اسحاق اور سیرت ابن ہشام دونوں میں موجود ہے[2] اور ہر دور میں مسلمانوں میں اس قدر معروف اور رائج رہا ہے کہ ہمارے علم کی حد تک اس کا انکار کسی سے مروی نہیں ہے۔

ثنایا، سامنے کے دانتوں کو کہتے ہیں اور جن میں سے دو اوپر کو "ثنایا علیا" اور دو نیچے کو "ثنایا سفلی" کہتے ہیں۔ جو عام طور مسکراتے ہوئے نظر آتے ہیں، وہ "ثنایا علیا" ہیں۔ اور اللہ کے رسول ﷺ کا غزوہ احد میں ایک دانت مبارک شہید ہوا جو کہ "رباعیۃ" تھا یعنی ثنایا کے ساتھ والا دانت تھا۔

اللہ کے رسول ﷺ کے بارے جو روایات میں ملتا ہے کہ سامنے کے دانت چمکتے تھے تو عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت میں ثنایا علیا کا ذکر ہے کہ ان سے گویا نور نکلتا تھا۔[3] اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ ثنایا بہت چمکدار تھے۔[4] اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں ہے کہ دانتوں کے مابین خلاء تھا۔[5]

یہ تو روایات میں جمع ہو گئی کہ دونوں قسم کی روایات میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ جن روایات میں دانتوں کے چمکنے کا ذکر ہے تو وہاں ثنایا کی بات ہو رہی ہے اور غزوہ احد میں جو دانت مبارک شہید ہوا تو وہ رباعی تھا۔ اور دوسری بات یہ کہ نبی کی ذات میں عیب نہیں ہوتا تو یہ بات درست ہے۔ اور اللہ کے رسول ﷺ میں پیدائشی طور کوئی عیب نہیں ہے اور نہ ہی نبوت کے دعوی کے وقت ہے کہ لوگوں کو کوئی اشکال پیدا ہو۔

---

[1] صحيح مسلم: 1417/3

[2] عبد الملك بن هشام بن أيوب الحميري، جمال الدين (المتوفى: 213هـ)، السيرة النبوية لابن هشام، شركة مكتبة ومطبعة مصطفى البابي الحلبي وأولاده بمصر، الطبعة الثانية، 1375هـ - 1955 م، 80/2

[3] الدارمي، أبو محمد عبد الله بن عبد الرحمن (المتوفى: 255هـ)، سنن الدارمي، دار المغني للنشر والتوزيع، المملكة العربية السعودية، الطبعة الأولى، 1412 هـ - 2000 م، 203/1

[4] ابن عساكر، أبو القاسم علي بن الحسن بن هبة الله (المتوفى: 571هـ)، تاريخ دمشق، دار الفكر للطباعة والنشر والتوزيع، بيروت، 1415 هـ - 1995 م، 76/18

[5] البيهقي، أحمد بن الحسين بن علي، أبو بكر (المتوفى: 458هـ)، دلائل النبوة ومعرفة أحوال صاحب الشريعة، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى، 1405 هـ، 303/1

رہا، اللہ کے رسول ﷺ کا غزوہ احد میں دانت مبارک کا شہید ہونا تو یہ عیب نہیں یہ تو شہادت ہے، نبی کے اپنے دعوی نبوت میں سچے ہونے کی شہادت کہ جو انہوں نے اپنے وجود سے دی ہے۔ دنیا کی نظر میں اپنے دشمن کے ہاتھوں مقتول ہو جانے سے بڑا کوئی عیب ہے، اور رسول مقتول بھی ہوئے ہیں۔ لیکن اللہ کے لیے مقتول ہونا، چاہے دشمن سے ہو، یہ عیب نہیں ہے۔ اللہ سمجھ عطا فرمائے۔

چلیں! ایک اور مثال سے سمجھتے ہیں۔ آپ کے بال بہت خوبصورت ہیں، کندھوں تک آتے ہیں، ان بالوں کی وجہ سے آپ کی بہت وجاہت ہے، لیکن حج کے موقع پر آپ نے حلق کروالیا تو یہ عیب نہیں ہے کہ اللہ کے لیے قربان ہونے والی شیء عیب دار نہیں، مزید خوبصورت بنا دیتی ہے، لیکن دیکھنے والی آنکھ ایمان کی ہو کہ وہ تو جسم میں اللہ کا حکم دیکھتی ہے، کہ کتنا جاری ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ بھی کندھوں تک بال رکھ لیتے تھے اور حلق بھی کروالیتے تھے۔ اور اس حلق سے آپ ﷺ کی خوبصورتی بڑھ جاتی تھی۔

چچا، پھوپھی، ماموں اور خالہ کی بیٹی سے شادی

ایک دوست نے سوال کیا ہے کہ بعض منکرین حدیث کا دعوی ہے کہ چچا، پھوپھی، ماموں اور خالہ کی بیٹی سے نکاح جائز نہیں ہے، تو اس کی کیا حقیقت ہے؟ میں نے پوچھا کہ وہ اس دعوے کی کیا دلیل بیان کرتے ہیں؟ تو دوست نے کہا کہ سورۃ الاحزاب کی آیت 50 کا حوالہ دیتے ہیں۔ مذکورہ آیت یوں ہے:

﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَحْلَلْنَا لَكَ أَزْوَاجَكَ اللَّاتِي آتَيْتَ أُجُورَهُنَّ وَمَا مَلَكَتْ يَمِينُكَ مِمَّا أَفَاءَ اللَّهُ عَلَيْكَ وَبَنَاتِ عَمِّكَ وَبَنَاتِ عَمَّاتِكَ وَبَنَاتِ خَالِكَ وَبَنَاتِ خَالَاتِكَ اللَّاتِي هَاجَرْنَ مَعَكَ وَامْرَأَةً مُّؤْمِنَةً إِن وَهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ إِنْ أَرَادَ النَّبِيُّ أَن يَسْتَنكِحَهَا خَالِصَةً لَّكَ مِن دُونِ الْمُؤْمِنِينَ﴾[1]

"اے پیغمبر ہم نے تمہارے لئے تمہاری بیویاں جن کو تم نے ان کے مہر دے دیئے ہیں حلال کر دی ہیں۔ اور تمہاری لونڈیاں جو خدا نے تم کو (کفار سے بطور

---
[1] الأحزاب: 33: 50

مال غنیمت) دلوائی ہیں اور تمہارے چچا کی بیٹیاں اور تمہاری پھوپھیوں کی بیٹیاں اور تمہارے ماموؤں کی بیٹیاں اور تمہاری خالاؤں کی بیٹیاں جو تمہارے ساتھ وطن چھوڑ کر آئی ہیں (سب حلال ہیں)۔ اور کوئی مومن عورت اگر اپنے تئیں پیغمبر کو بخش دے (یعنی مہر لینے کے بغیر نکاح میں آنا چاہے) بشرطیکہ پیغمبر بھی ان سے نکاح کرنا چاہیں (وہ بھی حلال ہے لیکن) یہ اجازت (اے محمد ﷺ) خاص تم ہی کو ہے سب مسلمانوں کو نہیں۔“

اب احادیث کا انکار کرنے والوں نے ﴿خَالِصَةً لَّكَ مِن دُونِ الْمُؤْمِنِينَ﴾ کہ یہ اجازت اہل ایمان کے علاوہ خاص آپ ﷺ کے لیے ہے، کے الفاظ سے یہ استدلال کیا ہے کہ چچا، پھوپھی، ماموں اور خالہ کی بیٹی سے نکاح کی اجازت صرف آپ ﷺ کے لیے خاص ہے، عام مسلمانوں کے لیے نہیں ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ ﴿خَالِصَةً لَّكَ مِن دُونِ الْمُؤْمِنِينَ﴾ کا تعلق صرف ﴿وَامْرَأَةً مُّؤْمِنَةً إِن وَهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ إِنْ أَرَادَ النَّبِيُّ أَن يَسْتَنكِحَهَا﴾ سے ہے کہ اگر کوئی عورت خود سے اپنے آپ کو نبی ﷺ کے لیے ہبہ کر دے تو یہ صورت صرف آپ ﷺ کے لیے جائز ہے۔ عام مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے کہ کوئی عورت خود سے اپنے آپ کو اس کے لیے ہبہ کر دے کہ اس عورت سے تمتع اس کے جائز ہو جائے۔ ہبہ کرنے سے مراد یہ ہے کہ وہ عورت اپنے ولی کی اجازت اور حق مہر کے بغیر نبی کے نکاح میں آنا چاہے تو ایسا جائز ہے لیکن یہ حکم بھی عارضی تھا کہ بعد میں ﴿لَّا يَحِلُّ لَكَ النِّسَاءُ مِن بَعْدُ﴾ کے حکم کے ذریعے مزید کسی بھی قسم کے نکاح سے آپ ﷺ کو روک دیا گیا۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگر ﴿خَالِصَةً لَّكَ مِن دُونِ الْمُؤْمِنِينَ﴾ کا تعلق تمام آیت سے مان لیا جائے تو اس کا مطلب ہے کہ شروع آیت میں جو بیان ہے کہ وہ بیویاں کہ جن کے حق مہر ادا کیے گئے ہوں، وہ بھی صرف نبی ﷺ کے لیے ہی حلال ہوں گی۔ اور اس طرح منکر حدیث کے لیے اس کی کوئی بھی بیوی کہ جس کا حق مہر وہ ادا کر چکا ہو،

حلال نہ رہے گی۔ تیسری بات یہ کہ ﴿خَالِصَةً﴾ جو کہ نصب میں ہے حال ہے، ﴿وَامْرَأَةً﴾ سے جو کہ اس کا ذوالحال ہے لہٰذا وہ معنی جو کہ منکر حدیث بیان کر رہا ہے، عربی زبان اور گرامر کے خلاف ہے۔ اور حال اور صفت میں فرق یہ ہے کہ حال عارضی ہوتا ہے جبکہ صفت میں دوام ہوتا ہے جیسا کہ ہنسنا انسان کا حال ہے جبکہ گورا ہونا صفت ہے۔ چوتھی بات یہ ہے کہ سورۃ النساء کی آیت 24 میں عام مسلمانوں کے لیے محرمات کی فہرست بیان کر کے باقی سب کو حلال کر دیا گیا۔ اور باقی سب میں چچا، پھوپھی، ماموں اور خالہ کی بیٹی بھی شامل ہے۔

پانچویں بات یہ ہے کہ آل بیت میں ایسی شادیاں ہوئی ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی بیٹی زینب رحمہا اللہ کا نکاح ان کے چچازاد بھائی عبد اللہ بن جعفر رحمہ اللہ سے کیا۔ اسی طرح حضرت ام کلثوم بنت علی رحمہا اللہ کا نکاح حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد ان کے چچازاد بھائی عون بن جعفر رحمہ اللہ سے ہوا۔ اور ان کی وفات کے بعد ان کے بھائی محمد بن جعفر رحمہ اللہ سے ہوا۔ اور ان کی وفات کے بعد ان کے بھائی عبد اللہ بن جعفر رحمہ اللہ سے ہوا اور انہی سے زینب بنت علی رضی اللہ عنہا کا نکاح بھی ہو چکا تھا۔[1] اور اس کی مثالیں صحابہ میں بہت زیادہ ہیں بلکہ ایک اعتبار سے غور کریں تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نکاح بھی اپنے چچا کی پوتی سے ہوا ہے جبکہ بنات کا لفظ بیٹیوں اور پوتیوں دونوں کو شامل ہے۔

خلاصہ کلام

خلاصہ کلام یہی ہے کہ احادیث پر اصولی اور فروعی اعتراضات یا تو نظری تعصب کا نتیجہ ہیں یا پھر مسلسل ایک مخصوص زاویے ہی سے احادیث کو دیکھنے کا اثر ہے۔ اور احادیث پر کوئی بھی اصولی یا فرعی اعتراض ایسا نہیں ہے کہ جس کا منقول و معقول جواب موجود نہ ہو۔ ہمیں احساس ہے کہ بعض ایسی روایات کا ابھی ہم نے طوالت کے خوف

[1] محمد بن سعد بن منيع البصري، أبو عبد الله (المتوفى: 230هـ)، الطبقات الكبرى، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى، 1410 هـ - 1990 م، 338/8

سے ذکر نہیں کیا ہے کہ جن پر اعتراضات کیے گیے ہیں۔ ہم نے اپنی کتاب ”مکالمہ“ میں بہت سی ایسی دیگر روایات کو بھی موضوع بحث بنا کر ہر اعتراض کی نوعیت اور حقیقت کا نقلی و عقلی تجزیہ کیا ہے۔

۞۞۞۞۞۞۞

مصنف کی نئی کتاب

اسلامی نظریہ حیات

مصنف کی نئی زیر ترتیب کتاب کا عنوان "اسلامی نظریہ حیات" (Islamic Ideology of Life) ہے۔ یہ کتاب فلسفہ، سائنس، مذہب، لسانیات، علمیات، فنون لطیفہ، معاشیات، معاشرت وغیرہ جیسے موضوعات پر مختصر اور جامع الفاظ میں اسلامی بیانیے (Islamic Narrative) کا بیان ہے۔ یہ بیانہ بارہ صفحات پر مشتمل ہے جبکہ ایک صد سے زائد صفحات پر مشتمل حواشی میں اس کے اختصار کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ یہ کتاب درج ذیل ابواب پر مشتمل ہے:

پہلا باب: مبدا اور معاد (Entry and Exit)

دوسرا باب: روایت اور فہم (Tradition and Hermeneutic)

تیسرا باب: علم اور قوت(Power and Knowledge)

چوتھا باب: ایمان اور اخلاق (Belief and Ethics)

پانچواں باب: ادبیات اور جمالیات (Literature and Aesthetic)

چھٹا باب: عقل اور منطق (Intellect and Reason)

مصنف کی نئی کتاب

مکالمہ

مصنف کی نئی زیر ترتیب کتاب کا عنوان "مکالمہ" (dialogue) ہے۔ یہ کتاب فلسفہ، سائنس، مذہب، لسانیات، علمیات، فنون لطیفہ، معاشیات، معاشرت اور حجیت حدیث وغیرہ جیسے موضوعات پر ان مکالمات پر مشتمل ہے جو فیس بک وغیرہ پر مختلف علم دوست ساتھیوں سے مباحثے کے نتیجے میں مرتب ہوئے۔ یہ کتاب درج ذیل ابواب پر مشتمل ہے:

پہلاباب:	علم اور وجود
دوسرا باب:	الحاد اور ایمان
تیسرا باب:	توحید اور شرک
چوتھا باب:	روایت اور جدیدیت
پانچواں باب:	سیرت اور تاریخ
چھٹا باب:	فلسفہ اور سائنس
ساتوانباب:	مذہب اور ریاست
آٹھوانباب:	لسانیات اور نفسیات
نواں باب :	معیشت اور معاشرت
دسوانباب:	تعلیم اور تحقیق
گیارہوانباب:	تصوف اور تزکیہ
بارہوانباب:	فنون لطیفہ
تیرہوانباب:	غلو اور اعتدال
چودہوانباب:	امن اور رواداری
پندرہوانباب:	اعلام اور شخصیات
سولہوانباب:	انکار حدیث اور حجیت حدیث

مصادر ومراجع

- (أمالي) محمد أنور شاه بن معظم شاه الكشميري الهندي ثم الديوبندي (المتوفى: 1353هـ)، فيض الباري على صحيح البخاري، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى، 1426 هـ - 2005م
- ابن أبي داود، أبو بكر عبد الله بن سليمان بن الأشعث الأزدي السجستاني (المتوفى: 316هـ)، كتاب المصاحف، الفاروق الحديثة، القاهرة، الطبعة الأولى، 1423هـ - 2002م
- ابن الجزري، شمس الدين أبو الخير محمد بن محمد بن يوسف (المتوفى: 833هـ)، منجد المقرئين ومرشد الطالبين، دار الكتب العلمية، الطبعة الأولى، 1420هـ - 1999م
- ابن الجزري، شمس الدين أبو الخير، محمد بن محمد بن يوسف (المتوفى : 833 هـ)، النشر في القراءات العشر، المطبعة التجارية الكبرى، مصر
- ابن الصلاح، عثمان بن عبد الرحمن، أبوعمرو، تقي الدين (المتوفى: 643هـ)، معرفة أنواع علوم الحديث، ويُعرف بمقدمة ابن الصلاح، دار الفكر المعاصر، بيروت، 1406هـ - 1986م
- ابن تيمية، تقي الدين أبو العباس أحمد بن عبد الحليم الحراني (المتوفى: 728هـ)، مجموع الفتاوى، مجمع الملك فهد، المملكة العربية السعودية، 1416هـ/1995م
- ابن حجر العسقلاني، أبو الفضل أحمد بن علي بن محمد بن أحمد (المتوفى: 852هـ)، تهذيب التهذيب، دائرة المعارف النظامية، الهند، الطبعة الأولى، 1326هـ
- ابن عبد البر، أبو عمر يوسف بن عبد الله بن محمد النمري (المتوفى: 463هـ)، الاستذكار، دار الكتبالعلمية، بيروت، الطبعة الأولى، 1421 هـ – 2000م

- ابن عساكر، أبو القاسم علي بن الحسن بن هبة الله (المتوفى: 571هـ)، تاريخ دمشق، دار الفكر للطباعة والنشر والتوزيع، بيروت، 1415 هـ - 1995 م
- ابن قيم الجوزية، محمد بن أبي بكر بن أيوب بن سعد شمس الدين (المتوفى: 751هـ)، إعلام الموقعين عن رب العالمين، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى، 1411هـ - 1991م
- ابن قيم الجوزية، محمد بن أبي بكر بن أيوب بن سعد شمس الدين (المتوفى: 751هـ)، مختصر الصواعق المرسلة على الجهمية والمعطلة، دار الحديث، القاهرة، الطبعة الأولى، 1422هـ - 2001م
- ابن قيم الجوزية، محمد بن أبي بكر بن أيوب بن سعد شمس الدين (المتوفى: 751هـ)، المنار المنيف في الصحيح والضعيف، مكتبة المطبوعات الإسلامية، حلب، الطبعة الأولى، 1390هـ/1970م
- ابن قيم الجوزية، محمد بن أبي بكر بن أيوب بن سعد شمس الدين (المتوفى: 751هـ)، زاد المعاد في هدي خير العباد، مؤسسة الرسالة، بيروت الطبعة السابعة والعشرون، 1415هـ/1994م
- ابن ماجة، أبو عبد الله محمد بن يزيد القزويني (المتوفى: 273هـ)، سنن ابن ماجة، دار الرسالة العالمية، الطبعة الأولى، 1430 هـ - 2009 م
- أبو الفتح عثمان بن جني الموصلي (المتوفى: 392هـ)، المحتسب في تبيين وجوه شواذ القراءات والإيضاح عنها، وزارة الأوقاف- المجلس الأعلى للشئون الإسلامية، المملكة العربية السعودية، 1420هـ- 1999م
- أبو داود، سليمان بن الأشعث بن إسحاق الأزدي (المتوفى: 275هـ)، سنن أبي داؤد، المكتبة العصرية، بيروت

- احمد بن عبد الكريم بن عبيد، روايات ونسخ الجامع الصحيح للإمام أبي عبد الله محمد بن إسماعيل البخاري دراسة وتحليل، دار إمام الدعوة، الرياض، 1426ھ
- إرشاد الفحول إلي تحقيق الحق من علم الأصول، دار الكتاب العربي، بيروت، الطبعة الأولى، 1419ھ - 1999م
- اصلاحی، امین احسن، مولانا، مبادی تدبر حدیث، فاران فاؤنڈیشن، لاہور، 1994ء
- الباجي، أبو الوليد سليمان بن خلف بن سعد بن أيوب الأندلسي (المتوفى: 474ھ)، التعديل والتجريح لمن خرج له البخاري في الجامع الصحيح، دار اللواء للنشر والتوزيع، الرياض، الطبعة الأولى، 1406ھ– 1986ء
- البخاري، محمد بن إسماعيل أبو عبدالله الجعفي، صحيح البخاري، دار طوق النجاة، مصر، الطبعة الأولى، 1422ھ
- البيهقي، أحمد بن الحسين بن علي، أبو بكر (المتوفى: 458ھ)، دلائل النبوة ومعرفة أحوال صاحب الشريعة، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى، 1405 ھ
- الحسين بن علي بن محمد بن جعفر، أبو عبد الله الصَّيْمَري الحنفي (المتوفى: 436ھ)، أخبار أبي حنيفة وأصحابه، دار عالم الكتب، بيروت، الطبعة الثانية، 1405ھ - 1985م
- الخطيب البغدادي، أحمد بن علي بن ثابت بن أحمد بن مهدي (المتوفى: 463ھ)، تاريخ بغداد، دار الغرب الإسلامي، بيروت، الطبعة الأولى، 1422ھ - 2002م
- الدارمي، أبو محمد عبد الله بن عبد الرحمن (المتوفى: 255ھ)، سنن الدارمي، دار المغني للنشر والتوزيع، المملكة العربية السعودية، الطبعة الأولى، 1412 ھ - 2000 م
- الذهبي، شمس الدين أبو عبد الله محمد بن أحمد بن عثمان

بن قَايْماز (المتوفى: 748هـ)، ميزان الاعتدال في نقد الرجال، دار المعرفة، بيروت، الطبعة الأولى، 1382 هـ - 1963 م

- سحر السيد عبد العزيز سالم، أضواء على مصحف عثمان بن عفان رضي الله عنه ورحلته شرقا وغربا، مؤسسة شباب الجامعة، الإسكندرية، 1991م
- سلمان ندوی، سید، سیرت عائشه، دار الابلاغ، لاہور، 2010ء
- السيوطي، عبد الرحمن بن أبي بكر، جلال الدين (المتوفى: 911هـ)، الإتقان في علوم القرآن، الهيئة المصرية العامة للكتاب، مصر، 1394هـ/ 1974 م
- السيوطي، عبد الرحمن بن أبي بكر، جلال الدين (المتوفى: 911هـ)، تدريب الراوي في شرح تقريب النواوي، دار طيبة، الرياض
- عبد الملك بن هشام بن أيوب الحميري، جمال الدين (المتوفى: 213هـ)، السيرة النبوية لابن هشام، شركة مكتبة ومطبعة مصطفى البابي الحلبي وأولاده بمصر، الطبعة الثانية، 1375هـ - 1955 م
- علي بن سليمان العبيد، الدكتور، جمع القرآن الكريم حفظا وكتابة، مجمع الملك فهد، المدينة المنورة
- غامدی، جاوید احمد، میزان، المورد، لاہور، 2009ء
- مالك بن أنس بن مالك بن عامر الأصبحي المدني (المتوفى: 179هـ)، موطأ الإمام مالك، مؤسسة زايد بن سلطان آل نهيان، أبو ظبي، الطبعة الأولى، 1425 هـ - 2004 م
- محمد بن سعد بن منيع البصري، أبو عبد الله (المتوفى: 230هـ)، الطبقات الكبرى، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى، 1410 هـ - 1990 م
- محمد زبیر، حافظ، فکر غامدی: ایک تحقیقی وتجزیاتی

مطالعه، مکتبه رحمة للعالمين، لاہور، 2012ء

- محمد عجاج بن محمد تميم بن صالح الخطيب، السنة قبل التدوين، دار الفكر، بيروت، الطبعة الثالثة، 1400 ھ - 1980م
- مسلم بن الحجاج أبو الحسن القشيري النيسابوري (المتوفى: 261ھ)، المسند الصحيح المختصر بنقل العدل عن العدل إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم، دار إحياء التراث العربي، بيروت
- مصطفى بن حسني السباعي (المتوفى: 1384ھ)، السنة ومكانتها في التشريع الإسلامي، المكتب الإسلامي، دمشق، الطبعة الثالثة، 1402 ھ - 1982 م
- مجله الواقعه، اپریل 2012ء، مکتبه دار الاحسن، کراچی
- ماہنامه محدث، مارچ 2008ء، مجلس تحقیق اسلامی، لاہور
- ماہنامه رشد، ستمبر 2009ء، مجلس تحقیق اسلامی، لاہور
- ماہنامه رشد، مارچ 2010ء، مجلس تحقیق اسلامی، لاہور
- Harald Motzk, "Alternative accounts of the Quran's formation", in The Cambridge Companion to the Quran, ed. Jane Dammen McAuliffe, UK: Cambridge University Press, 2006
- Malise Ruthven, Fundamentalism: A Very Short Introduction, London: Oxford University Press, 2007
- http://ia601606.us.archive.org/14/items/QRaaNT/QRaaNTH.pdf
- http://www.darulifta-deoband.com/home/ur/Hadith--Sunnah/11124
- http://www.unicef.org/lac/2._20160308_UNICEF_LACRO_min_age_of_sexual_consent.pdf
- https://archive.org/details/standard1-quran
- https://www.facebook.com/hm.zubair.52